اکابرین دیوبند، بالخصوص شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنی
کے افکار و نظریات کا بے باک ترجمان

مجلّہ صفدر

...... بیاد ......
امام اہل سنت، شیخ الحدیث، حضرۃ مولانا
محمد سرفراز خان صفدرؒ

...... فیضان ......
قائد اہل سنت، وکیل صحابہ، حضرت مولانا
قاضی مظہر حسین رحمہ اللہ

...... سرپرست ......
پیر طریقت، شیخ الحدیث، حضرت مولانا
حبیب الرحمٰن سومرو مدظلہم

...... نگران ......
وکیل احناف، مناظر اسلام، حضرت مولانا
مفتی محمد انور اوکاڑوی مدظلہم

...... مدیر اعلیٰ ......
مولانا جمیل الرحمٰن عباسی

مسئول: احسن خدامی
0320-4902150

مدیر: حمزہ احسانی
0307-5687800

فی شمارہ: 25......زر سالانہ: 300 روپے

ترتیب

برائے رابطہ
احسن خدامی، مکان نمبر 4، گلی نمبر 82
محمود سٹریٹ، محلّہ سردار پورہ، اچھرہ، لاہور

امام ربانی، حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ تعالیٰ

تجلیات رمضان کے بارے میں ایک مکتوب

جاننا چاہئے کہ رمضان کا مہینہ بڑا بزرگ ہے، عبادتِ نفلی از قسم نماز، روزہ، صدقہ وغیرہ، جو اِس مہینے میں ادا کی جائے، دوسرے دنوں کے فرضوں کے ادا کرنے کے برابر ہے، اور اِس مہینے کے فرضوں کا ادا کرنا دوسرے مہینے کے ستر فرضوں کے ادا کرنے کے برابر ہے۔ اگر کوئی شخص اِس مہینے میں روزہ دار کو روزہ افطار کرائے [تو حق تعالیٰ شانہ] اُس کو بخش دیتے ہیں اور اُس کی گردن کو دوزخ سے آزاد کردیتے ہیں اور اُس کو روزہ دار کے اجر کے برابر اجر عطاء کرتے ہیں، بغیر اِس کے کہ روزہ دار کے اجر کو کم کریں۔ اور ایسے ہی اگر کوئی اپنے غلاموں کے کام کاج میں کمی کرے، حق تعالیٰ اُس کو بخش دیتا ہے اور اُس کی گردن دوزخ سے آزاد کردیتا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیدیوں کو آزاد کردیا کرتے تھے اور جو کوئی آپ سے کچھ مانگتا اُس کو دے دیتے تھے۔

اگر کسی شخص کو اِس مہینے میں خیرات اور اعمال صالح کی توفیق حاصل ہوجائے تو تمام سال تک توفیق اس کے شامل حال رہتی ہے، اور اگر یہ مہینہ پراگندگی سے گذرا تو تمام سال ہی پراگندہ گذرتا ہے۔ جہاں تک ہوسکے اِس مہینے کی جمعیت میں کوشش کرنی چاہئے اور اس مہینے کو غنیمت جاننا چاہئے۔ اس مہینے کی ہر رات میں کئی ہزار دوزخ کے لائق آدمیوں کو (حق جل شانہ [ناقل]) آزاد کرتے ہیں اور اس مہینے میں بہشت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور شیطانوں کو زنجیریں ڈال دی جاتی ہیں اور رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

افطار میں جلدی کرنا اور سحر میں دیر سے کھانا سنت ہے، اِس بارے میں آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم بڑا مبالغہ کرتے تھے۔ اور شاید سحر کی تاخیر اور افطار کی جلدی میں اپنے عجز واحتیاج کا اظہار ہے جو مقام بندگی کے مناسب ہے، اور کھجور یا چھوہارہ سے افطار کرنا سنت ہے، اور افطار کے وقت آنخضرت ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ **''ذهب الظمأ وابتلت العروق و ثبت الأجر إن شاء الله''** (پیاس دور ہوگئی، اور رگیں تر ہوگئیں اور اجر ثابت ہوگیا۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ)

تراویح کا ادا کرنا اور قرآن مجید کا ختم کرنا اِس مہینے میں سنت مؤکدہ ہے اور اس سے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں وفقنا الله سبحانه بحرمة حبيبه عليه وعلى آله الصلوات والتسليمات.

پیامِ صفدر

احسن خدامی

رمضان المبارک کی ساعات...... برما میں مسلمانوں پر مظالم

قارئین کرام کے ہاتھوں میں یہ شمارہ پہنچتے تک رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو چکا ہوگا۔ یوں تو ایک مسلمان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ عبادتِ الٰہی کی دھن اور رضائے خداوندی کی تلاش میں صرف ہونا چاہیئے، مگر اللہ جل شانہ کی طرف سے کچھ دن، کچھ لمحات، کچھ راتیں اور کچھ اوقات ایسے ہوتے ہیں جن میں اللہ جل شانہ کی رحمت خاص طور پر بندوں کی طرف متوجہ ہوتی ہے، رحمتوں کے دروازے کھل جاتے ہیں، نیکیوں کے اجر بڑھ جاتے ہیں، زمین پر آسمان کی برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور اللہ جل شانہ کی رضا خود آگے بڑھ کر بندوں کا استقبال کرتی ہے۔ رمضان کا پورا مہینہ بھی انہی اوقات میں سے ہے۔

خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے اس بابرکت مہینے کی قدر کی، اس میں اپنے آپ کو گناہوں اور لایعنی سے محفوظ رکھا، اپنے اوقات کو تلاوت و نماز، ذکر و استغفار اور خدمت و دعا میں صرف کیا، اور بدبخت و بدنصیب ہے وہ انسان جس نے اس مہینے کو بھی فضولیات و لایعنی میں برباد کیا، جو رحمتوں اور برکتوں کی اس بارش میں بھی پیاسے کا پیاسا ہی رہا، اور جو اللہ کی رضا کے اس موسم میں بھی خالی ہاتھ ہی رہا۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو اس پاک مہینے کی قدر کرنے، اس سے فائدہ اٹھانے، اس میں اپنے لئے مغفرت و رضا کے پروانے حاصل کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں۔

برما میں مسلمانوں پر مظالم:

کوئی ایک صدی سے جاری مسلمانوں کے زوال کا موسم ابھی ختم نہیں ہوا۔ جس وقت یہ سطور لکھی جارہی ہیں، ایک بار پھر برما کے مسلمانوں کے ساتھ آگ اور خون کی ہولی جاری ہے، وحشی بدھ درندے حیوانیت کی ساری حدوں کو پار کر چکے ہیں، برما کے مسلمان بھائی وحشت و بربریت اور ظلم کی اس اندھیر نگری میں جب چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھتے ہیں تو بلند و بالا عمارتوں، چمکتے دمکتے شاپنگ مالز، چمچماتی گاڑیوں اور زرق برق کپڑوں سے آلودہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی مسلمان قوم میں سے انہیں کوئی ایک بھی اپنا بھائی اور مددگار دستیاب نہیں ہے۔ ہاں......! مسلم ممالک کے چیختے چنگھاڑتے ہوائی جہاز، دیوہیکل ٹینک، ماہر و مشاق چاک و چوبند فوجی، طرح طرح کے میزائل...... ان میں سے کچھ بھی اُن کی مدد کے لیے نہیں ہے...... کاش کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر غور کرے کہ بحیثیت قوم ہم اس ذلت اور رسوائی کی زندگی سے کیسے چھٹکارہ پا سکتے ہیں، اور کچھ نہیں تو آیئے رمضان المبارک کی ساعات کے کچھ لمحے، کچھ دعائیں اور کچھ آنسو ہی اپنے ان مظلوم بھائیوں کی نذر کرتے ہیں۔ ☆☆☆☆

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہ

رمضان المبارک میں اکابر کے معمولات

''یہ سطور قارئین کرام تک پہنچنے تک محبت، عبادت اور مجاہدے کا بابرکت مہینہ رمضان المبارک شروع ہو چکا ہوگا۔ اس کی بابرکت ساعات کو کس طرح صرف کیا جائے اور اللہ جل شانہ کی بے پایاں رحمتوں کو کس طرح لوٹا جائے؟ آیئے اپنے اسلاف کرام رحمہم اللہ کے رمضان کے حالات و معمولات کو ملاحظہ کرتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکابر رحمہم اللہ جو علوم کے بحر بیکراں، فنون میں یگانہ، معارف میں یکتا تھے، اللہ کی محبت و عبادت کے میدان میں ان کا کیا مقام تھا اور مجاہدات وطاعات میں ان کا کیا درجہ تھا۔ لمثل هذا فليعمل العاملون.''

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کا رمضان:

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی سوانح عمری ''تذکرۃ الرشید'' کے مصنف حضرت نور اللہ مرقدہ کے رمضان کے معمولات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ریاضت ومجاہدہ کی یہ حالت تھی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا اور لوگ ترس کھایا کرتے تھے۔ چنانچہ اس پیرانہ سالی میں جب آپ ستر (۷۰) سال کی عمر سے متجاوز ہو لیے تھے، کثرتِ عبادت کا یہ عالم تھا کہ دن بھر کا روزہ اور بعد مغرب چھ (٦) کی جگہ بیس (۲۰) رکعت صلوٰۃ الاوابین پڑھا کرتے تھے، جس میں تخمیناً دو پارے سے کم کی تلاوت نہ ہوتی تھی۔ پھر اسی کے ساتھ رکوع وسجدہ اتنا طویل کہ دیکھنے والے کو سہو کا گمان ہو۔ نماز سے فارغ ہو کر مکان پر جاتے اور کھانا کھانے کے لیے مکان پر ٹھہرنے کی مدت میں کئی پارے کلام مجید ختم کرتے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد نماز عشاء اور صلوٰۃ تراویح میں تلاوت فرماتے جس میں گھنٹے سوا گھنٹے سے کم خرچ نہ ہوتا تھا۔ تراویح سے فارغ ہو کر ساڑھے دس گیارہ بجے آرام فرماتے اور دو اڑھائی بجے ضرور ہی اٹھ کھڑے ہوتے تھے، بلکہ بعض دفعہ خدام نے ایک ہی بجے آپ کو وضو کرتے پایا۔ اس وقت اٹھ کر دو اڑھائی تین گھنٹے تک تہجد میں مشغولیت رہتی تھی، بعض مرتبہ سحر کھانے کے لیے کسی خادم کو پانچ بجے جانے کا اتفاق ہوا اور آپ کو نماز ہی میں مشغول پایا۔

صلوٰۃ فجر کے بعد آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک وظائف، اوراد، اور مراقبہ وملاحظہ میں مصروفیت رہتی، پھر اشراق پڑھتے اور چند ساعت استراحت فرماتے۔ اتنے میں ڈاک آجاتی تو خطوط کے جوابات اور فتاویٰ لکھواتے اور چاشت کی نماز سے فارغ ہو کر قیلولہ فرماتے تھے۔ ظہر کے بعد حجرہ شریف بند ہو جاتا اور تاعصر کلام اللہ کی تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔

باوجودیکہ اس رمضان میں جس کا یہ مجاہدہ لکھا گیا ہے پیرانہ سالی اور نقاہت کے ساتھ وجع الورک کی تکلیف شدید کا یہ عالم تھا کہ استنجا گاہ سے حجرہ تشریف لانے میں، حالانکہ پندرہ سولہ قدم کا فاصلہ ہے، مگر راہ میں بیٹھنے کی نوبت آتی تھی۔ اس حالت میں فرائض تو فرائض، نوافل بھی کبھی بیٹھ کر نہیں پڑھے، اور پھر ان میں گھنٹوں کھڑا رہنا...... بارہا خدام نے عرض کیا کہ آج تراویح بیٹھ کر ادا فرماویں تو مناسب ہے، مگر جب آپ کا جواب تھا، یہی تھا: ''نہیں جی! یہ کم ہمتی کی بات ہے!''......اللہ رے ہمت! آخر '' افلا اکون عبدا شکورا '' کے قائل کی نیابت سہل نہ تھی جو اس ہمت کے بغیر حاصل ہو جاتی۔

یوں تو ماہ رمضان میں آپ کی ہر عبادت میں بڑھوتری ہوتی تھی مگر تلاوت کلام اللہ کا شغل خصوصیت کے ساتھ اس درجہ بڑھتا تھا کہ مکان تک آنے جانے میں کوئی بات نہ فرماتے تھے۔ نمازوں میں اور نمازوں کے بعد تخمیناً نصف ختم قرآن مجید آپ کا یومیہ معمول قرار پاتا تھا۔ جس شب کی صبح کو پہلا روزہ ہوتا تھا، آپ حضارِ جلسہ سے فرمادیا کرتے تھے کہ آج سے کچہری برخواست......! رمضان کو بھی آدمی ضائع کرے تو افسوس کی بات ہے۔ اس مجاہدہ پر غذا کی یہ حالت تھی کہ کامل رمضان بھر کی خوراک پانچ سیر اناج تک پہنچنی دشوار تھی۔''

[تذکرۃ الرشید، ص ۶۵، بحوالہ آپ بیتی، ص ۹۶]

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حضرت مدنی رحمہ اللہ کا رمضان:

شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کے متوسلین کی ایک بڑی تعداد چونکہ سلہٹ (بنگال) سے تعلق رکھتی تھی اس لیے ان کے اصرار پر حضرت قدس سرہ رمضان المبارک اکثر وہاں گزارا کرتے تھے۔ انہی خوش قسمت ساعات میں حضرتؒ کی ہم نشینی کا شرف حاصل کرنے والے مولوی عبد الحمید اعظمی صاحب حضرتؒ کے معمولاتِ رمضان کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا کا قیام تو داروغہ عبد الستار صاحب مرحوم کے مکان پر ہوتا تھا اور نئی سڑک کی بڑی مسجد جو قیام گاہ سے تقریباً دو فرلانگ ہے، اس میں حضرتؒ پانچوں وقت کی نماز پڑھا کرتے تھے، اور اسی میں زائرین، معتقدین دور دراز سے آ کر ماہ مبارک میں فروکش ہوتے تھے۔ چونکہ حضرت قدس سرہ کا پورے ماہ کا قیام ہوتا تھا، اس لیے نیت اقامت کی ہوتی تھی، اور جملہ نمازوں میں حضرتؒ خود ہی امامت کرتے تھے۔

ظہر کی نماز کے بعد مصلیٰ کے چاروں طرف سے جو بیسیوں بوتلیں پانی دم کرنے کی رکھی رہتی تھیں ان میں دم فرماتے تھے، اس کے بعد مصلی کے نیچے سے وہ درخواستیں نکالتے جو ظہر کی نماز تک وہاں جمع ہوتی رہتی تھیں، اور ان میں سے ہر ایک کو پڑھ کر صاحب درخواست کو بلا کر اس کی درخواست پوری فرماتے، تعویذ وغیرہ لکھتے، جس میں بیعت کی درخواست ہوتی ان سب کو ایک کونے میں جمع کرتے، ان درخواستوں سے فارغ ہونے کے بعد بیعت ہونے والے حضرات کو بیعت کرتے، پھر کچھ ارشاد و نصیحت کے بعد دولت خانہ پر تشریف لے جانے کے ساتھ کبھی

ذرا سا لیٹ گئے، ورنہ تلاوت میں مشغول ہوگئے۔ڈاک کا کام اگر باقی رہ گیا تو اس کو پورا کیا، اسی درمیان میں خصوصی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا، اتنے میں عصر کی اذان ہوجاتی، حضرت ضروریات سے فارغ ہوکر نمازِ عصر کے لیے تشریف لے جاتے۔

نمازِ عصر سے فارغ ہونے کے بعد مولانا حافظ محمد جلیل صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کے ساتھ سوا پارے کا دور فرماتے، اس طرح پر کہ پاؤ پارہ (یعنی سوا پارہ) حضرت پڑھتے اور پھر وہی پارہ حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب پڑھتے۔مغرب تک اس طرح رہتا کہ اگر غروب سے پہلے دور ختم ہوجاتا تو حضرت مراقب رہتے، اور رفقاء اپنے ذکر وشغل میں مشغول رہتے۔

افطار نہایت معمولی فرماتے جو عموماً کھجور اور زمزم پر مشتمل ہوتی۔یوں تو دسترخوان پر ناشپاتی، اناس، عمدہ کیلے، امرود، آم، بصری کھجوریں، ناریل کا پانی، پپیتے، میٹھے اور نمکین چاول بھی ہوتے تھے (عام ہندوستانی افطاری، پھلکیاں، چنے وغیرہ سے دسترخوان خالی ہوتے، پہلے تو میں سمجھا کہ شاید یہاں رواج نہیں، مگر تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ رواج تو خوب ہے مگر ان چیزوں کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے، اس لیے حضرت کے دسترخوان پر لانا معیوب سمجھتے ہیں) مگر ان سب کے باوجود حضرتؒ کا افطار بہت ہی مختصر ہوتا، اس وقت میں سارے دسترخوان پر چہل پہل اور فرحت وسرور کا دور ہوتا مگر حضرتؒ نوراللہ مرقدہ نہایت استغراق میں ساکت رہتے، افطار گاہ مسجد کے قریب ہی تھا لیکن دور کے ختم ہونے کے بعد سے جو استغراقی کیفیت ہوتی تو بعض مرتبہ اذان کی بھی اطلاع کرنی پڑتی۔افطار کی ان تنوعات کے باوجود، جو اوپر ذکر کیا گیا، حضرتؒ کا افطار کھجور زمزم کے بعد ایک آدھ قاش کسی پھل کی نوش فرما کر ناریل کا پانی نوش فرماتے اور ایک یا آدھی پیالی چائے کی نوش فرماتے لیکن دسترخوان کے ختم ہونے تک وہیں تشریف فرما ہوتے اور کبھی کبھی کوئی مزاحی تفریحی فقرہ بھی فرمادیا کرتے۔آٹھ دس منٹ اس افطار میں لگ جاتے، اس کے بعد حضرت مغرب کی نماز نہایت مختصر پڑھتے اور اس کے بعد دو رکعت نفل نہایت طویل، نصف گھنٹہ تک پڑھتے، اس کے بعد حضرت طویل دعا مانگتے جس میں سارے اہل مسجد چاہے مشغول ہوں یا فارغ، شرکت کرتے۔

حضرت مدنی نوراللہ مرقدہ کا مخصوص لہجہ اور ان کی نماز کا خشوع وخضوع نہ صرف ہندوستان بلکہ عرب اور حجاز میں بھی ممتاز اور مسلّم ہے۔سلہٹ میں حضرتؒ نماز اور تراویح کی امامت خود فرماتے، اس لیے تراویح کی شرکت کے لیے دور دراز سے روزانہ سینکڑوں آدمی آتے اور تراویح وتہجد کی شرکت فرما کر صبح سب اپنے گھر روانہ ہوجاتے۔ چونکہ مجمع دُور دُور سے آتا تھا، اذان کے بعد ہی مسجد پُر ہوجاتی تھی اور بعد میں آنے والوں کو جگہ نہیں ملتی تھی، حضرتؒ کے تشریف لے جانے کے لیے درمیان میں تھوڑی سی خالی جگہ رکھی جاتی تھی۔مسجد میں تشریف لاتے وقت متولی مسجد پانی کا گلاس پہلے سے بھر کر انتظار میں کھڑے ہوتے کہ حضرت مکان سے چائے وغیرہ سے فراغت کے بعد ایک پان کھا کر موٹر میں تشریف فرما ہوتے اور کلی کرکے سیدھے مصلیٰ پر پہنچتے تھے۔کثرت ہجوم کی وجہ سے ایک دو مکبر تو ضروری تھے اور اخیر عشرہ میں کئی کئی مکبر ہوجاتے تھے۔تراویح میں اڑھائی پارے قرآن پاک کے اس طرح پڑھتے کہ اول چار

رکعتوں میں مولوی جلیل سواپارہ پڑھتے اور اسی سواپارہ کو سولہ رکعتوں میں حضرت قدس سرہ پڑھتے۔ترویحہ بہت لمبا ہوتا، حضرت پر تراویح پڑھتے ہوئے بعض وقت ایک جوش پیدا ہوتا کہ اس وقت کی لذت تو سننے والے ہی کو معلوم ہے۔

تراویح کے بعد بہت طویل دعا ہوتی جس میں حاضرین پر گریہ وبکا کا ایسا زور ہوتا کہ بسا اوقات مسجد گونج جاتی۔تراویح کے بعد حضرت اپنے رفقاء اور خدام کے ساتھ وہیں چائے نوش فرماتے اور تقریباً دس منٹ بعد حضرت قدس سرہ وعظ کے لیے کھڑے ہوجاتے اور لوگ اپنی اپنی مسجد میں تراویح پڑھنے کے بعد حضرت کے وعظ میں شرکت کے لیے مسجد میں آجاتے۔لوگوں کی کثرت کی وجہ سے تل رکھنے کی جگہ نہیں رہتی تھی، بلکہ لوگ مسجد کے باہر سڑکوں پر کھڑے ہوتے، وہاں آواز نہیں پہنچتی تھی، اس لیے آلہ مکبر الصوت (لاؤڈ سپیکر) کا انتظام کیا گیا، اور اس وقت میں وعظ میں شرکت کرنے والوں کو، جن کی ہزاروں کی تعداد ہوتی تھی، چائے بھی خاموشی سے ملتی رہتی، مگر اس میں آواز بالکل نہ ہوتی تھی، اور نہ ہی کوئی ایسا شخص ہوتا تھا جس کو چائے نہ ملی ہو۔اتنے حضرت نور اللہ مرقدہ اپنی چائے سے فراغت پاتے، اتنے مجمع بھی چائے سے فارغ ہوجاتا، یہ وعظ بالکل اصلاحی ہوتا تھا، سیاسیات پر کوئی کلام طویل نہ ہوتا۔ایک آدھ لفظ بیچ میں چاشنی کے طور پر آجاتا۔

حضرت کے وعظ میں پرچہ بھی پہنچتا رہتا اور حضرت اس کو سن کر اس کا جواب بھی تفصیل سے دیتے، جب وسط رمضان کے بعد حضرتؒ کی طبیعت ناساز ہوگئی تو دوسرے لوگ وعظ کرتے تھے، لیکن حضرتؒ قدس سرہ باوجود ناسازئ طبع کے جب تک وعظ ختم نہ ہوتا وعظ میں تشریف فرما ہوتے، اس کے ایک گھنٹہ بعد وعظ ختم ہوکر مصافحے کا نمبر شروع ہوتا، باوجود انتظامات کے کار تک پہنچنے میں دیر لگ جاتی، مکان پر تشریف لانے کے بعد ہلکا سا ناشتہ پیش ہوتا جس میں جملہ حاضرین شرکت کرتے، ڈیڑھ بجے رات کو یہ مجلس ختم ہوجاتی، اس کے بعد حضرت اپنے حجرے میں تشریف لاتے، اس میں بھی بعض مخصوص حضرات سے تخلیے میں بات کرتے، اس کے بعد تقریباً آدھا گھنٹہ حضرت آرام فرماتے اور پھر تہجد کے لیے بیدار ہوجاتے اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد مسجد میں تہجد کے لئے تشریف لے جاتے۔

جو لوگ تہجد کی شرکت کے لیے دُور دُور سے آتے وہ سب حضرت نور اللہ مرقدہ کے پہنچنے سے پہلے، ورنہ پہلی رکعت میں ضرور شریک ہوجاتے۔تہجد میں دو قرآن کا معمول تھا، ایک حضرتؒ پڑھتے اور دوسرا مولانا محمد جلیل صاحب۔حضرت تہجد کے لیے تشریف لے جاتے وقت بہت اہتمام کرتے کہ آہٹ نہ ہو، کسی کی آنکھ نہ کھلے، مگر لوگ فرطِ شوق میں جاگ ہی جاتے تھے۔نفلوں کے بعد چونکہ سحری کا وقت بہت کم رہ جاتا تھا اس لیے فوراً اسی مکان پر سحری کا دسترخوان بچھ جاتا اور وقت کی تنگی کی وجہ سے جلدی جلدی انگلیاں اور منہ کھانے میں مشغول اور آنکھیں گھڑی پر اور کان مؤذن کی آواز پر ہمہ تن متوجہ رہتے، اور حضرتؒ سحری سے فراغت کے بعد تھوڑی دیر لیٹ جاتے اور پھر معاً نماز کی تیاری کرتے، مسجد میں تشریف لے جاتے اور اِسفار میں نماز ہوتی، لیکن اخیر عشرے میں اعتکاف کے زمانے میں غلس میں شروع ہوتی اور اِسفار تام میں ختم ہوتی۔واپس جانے والے حضرات الوداعی مصافحے کرتے اور

حضرتؒ اپنی قیام گاہ میں تشریف لاتے اور فوراً لیٹ جاتے۔ایک دو خادم بدن دباتے اور سر پر تیل ملا جاتا، اور حضرت بعض مرتبہ باتیں کرتے کرتے ہی سو جاتے۔رفقاء بھی سب سو جاتے۔

حضرتؒ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وضو استنجاء سے فارغ ہونے کے بعد تلاوتِ قرآن شریف میں مشغول ہو جاتے اور دس بجے سے ان لوگوں کو تخلیے کا وقت دے رکھا تھا، لیکن اس درمیان میں بھی اگر کچھ وقت ملتا تو حضرت قدس سرہ تلاوت میں مصروف ہو جاتے اور اسی وقت میں ڈاک بھی تحریر فرماتے۔اس سال چونکہ ڈاک کی ہڑتال تھی اس لیے دس رمضان تک تو ڈاک کا سلسلہ بند رہا اور گزشتہ ڈاک جو ساتھ تھی، اس کی تکمیل فرماتے رہتے، لیکن دس رمضان کے بعد ڈاک جب شروع ہو گئی تو اس کا انبار لگ گیا۔اس میں بہت وقت خرچ ہونے لگا۔اسی درمیان میں جن لوگوں کو کچھ خصوصی بات کرنی ہوتی وہ بھی آتے جاتے، یہ سلسلہ کبھی کبھی تو ظہر تک چلتا اور اگر کبھی وقت مل جاتا تو ظہر سے پہلے آدھا گھنٹہ آرام فرما لیتے۔

اس سال حضرت نور اللہ مرقدہ کی طبیعت ناساز رہی اور وسطِ رمضان سے ہی بخار وغیرہ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا، اس لیے بعض خدام نے اعتکاف کے متعلق استمزاج کیا کہ اعتکاف میں دقت زیادہ ہو گی۔حضرتؒ نے فرمایا کہ: نہیں! اعتکاف کی نیت کر لی ہے۔چنانچہ مسجد کے ایک کونے میں حضرتؒ کا معتکف بنا دیا گیا۔لیکن بخار کی شدت کی وجہ سے بسا اوقات دوران نماز میں سردی لگ جاتی، حضرتؒ چادر اوڑھ لیتے، برقی پنکھے بند کر دیئے جاتے اور بعض مرتبہ چائے پی کر اسی طرح نماز میں مشغول ہو جاتے اور اس طرح بخار ہی کی حالت میں تہجد میں طویل قیام اور لمبی قراءت کرنا پڑتی، کیونکہ قیام پر حضرتؒ کی ناسازئ طبع کی وجہ سے چار راتوں میں تہجد کی نماز با جماعت نہیں ہو سکی تھی، (نوافل کی باقاعدہ جماعت حضرت مدنی رحمہ اللہ کا تفرد تھا، جمہور احناف کے نزدیک صلوۃ الکسوف کے علاوہ نوافل کی جماعت جائز نہیں، کما فی فتح القدیر: ۱/۴۳۸ [احسن]) اس لیے قرآن ختم ہونے کو کافی باقی رہ گیا تھا، اس کمی کو اس عشرہ میں پورا کرنا ضروری تھا، اس پر مزید یہ کہ مسجد میں قیام اور لوگوں کے ہجوم اور اژدحام کے باعث رات کے نصف گھنٹے کا وہ سکون اور خاموشی بھی یہاں میسر نہیں تھی جو قیام گاہ پر حاصل تھی۔اس لیے مشاغل کی زیادتی کے ساتھ آرام کا بھی کوئی خاص موقع نہیں تھا۔

اخیر عشرے میں ہجوم بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، مسجد سے باہر سڑکوں پر بھی آدمی رہتے تھے جس کی وجہ سے ظہر کے بعد کی درخواستوں میں بھی کافی اضافہ ہو گیا تھا۔اس طرح سے بیعت ہونے والوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی اور مخصوص طالبین سالکین جن کو اپنے مخصوص حالات سنا کر ہدایت لینی تھی، ان کی تعداد تو بہت ہی بڑھ گئی تھی، حتی کہ ان کی نمبر وار باری مقرر کرنی پڑ گئی۔صبح کی نماز سے فارغ ہو کر جانے والوں کے مصافحوں کی بہت کثرت ہوتی، اس سے فارغ ہو کر حضرت اپنے معتکف میں تشریف لے جاتے اور تھوڑی دیر آرام فرمانے کے بعد جبکہ رات کا جاگا ہوا سارا مجمع گہری نیند سویا ہوا ہوتا، حضرتؒ اٹھ کر نہایت آہستہ آہستہ قدم بچا کر استنجاء تشریف لے جاتے اور وضو فرما کر اپنے معمولات میں مشغول ہو جاتے۔

شبِ قدر کے متوالے چھبیس کی صبح ہی سے مسجد میں آنے شروع ہو جاتے اور ہجوم بڑھتا رہتا، اس لیے کہ عوام میں شبِ قدر کے متعلق مشہور یہی ہے کہ وہ ستائیس کو ہوتی ہے، اس لیے مسجد کے آس پاس کی جگہ بھی کھچا کھچ بھر گئی اور ظہر کے بعد کی درخواستوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ حد نہیں۔ اور رات کو دم کرنے والی بوتلوں کا ہجوم حضرتؒ کے مصلے کے چاروں طرف پھیل گیا اور جب تہجد کے بعد حضرتؒ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا تو ساری مسجد رونے سے گونج گئی اور حضرتؒ کے اوپر جس کیف وسرور کی حالت دیکھی وہ بیان سے باہر ہے، شبِ قدر کی تعیین میں حضرتؒ کی مجلس میں گفتگوئیں شروع ہوتیں، راقم الحروف نے کہا کہ اہل اللہ کو تو شبِ قدر کے کوائف سارے معلوم ہو جاتے ہیں، معلوم نہیں اس سال اخیر راتوں میں کون سی رات میں شبِ قدر تھی؟ حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ اس سال شبِ قدر تیسویں شب میں تھی۔

تیسویں رمضان، چہارشنبہ کو عید کا چاند دیکھنے کے بعد حضرت شیخؒ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر تشریف لے گئے، اس شب میں بھی تہجد کی نماز جماعت کے ساتھ ہوئی اور حضرتؒ نے اس قدر طویل قیام فرمایا کہ سارے رمضان میں کسی رات میں اتنا طویل قیام تہجد میں نہیں فرمایا ہوگا۔ صبح کو ٹھیک ساڑھے نو بجے حضرتؒ نے اسی مسجد میں عید کی نماز پڑھائی۔'' [آپ بیتی، جلد دوم، ص ۱۰۷)

حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کا قرآن سے تعلق:

مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمہ اللہ تذکرۃ الخلیل میں حضرت مولانا یحییٰ صاحب (والد گرامی شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ) کے حالات میں لکھتے ہیں کہ:

''ایک مرتبہ میری درخواست پر رمضان میں قرآن شریف سنانے کے لیے میرٹھ تشریف لائے تو میں نے دیکھا کہ دن بھر میں چلتے پھرتے پورا قرآن مجید ختم فرما لیتے اور افطار کا وقت ہوتا تو ان کی زبان پر قل اعوذ برب الناس ہوتی تھی۔ ریل سے اُترے تو عشاء کا وقت ہو گیا تھا، ہمیشہ باوضو رہنے کی عادت تھی، اسی لیے مسجد میں قدم رکھتے ہی مصلے پر آ گئے اور تین گھنٹے میں دس پارے ایسے صاف اور رواں پڑھے کہ نہ کہیں لکنت تھی نہ متشابہ، گویا قرآن شریف سامنے کھلا رکھا ہے اور باطمینان پڑھ رہے ہیں، تیسرے دن ختم فرما کر روانہ ہو گئے کہ نہ دور کی ضرورت تھی نہ سامع کی''۔ [تذکرۃ الخلیل: ۲۰۴]

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا رحمہ اللہ اپنے والد محترم کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرٹھ کے اس سفر کے متعلق والد صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ میرٹھ کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ جب لوگوں میں یہ تذکرہ ہوا کہ ایک شخص سہارنپور سے تین دن میں قرآن شریف سنانے کے لیے آ رہا ہے، تو تیس چالیس حافظ محض امتحان کے لیے میرے پیچھے تراویح پڑھنے کے لیے آتے تھے، والد صاحب کو رمضان المبارک میں میری

طرح سے بخار نہیں آتا تھا، دوستوں کے اصرار پر ایک دودن کے لیے ان کے یہاں جا کر دوشب یا زیادہ سے زیادہ تین شب میں تراویح میں ایک قرآن پڑھ کر واپس آجاتے تھے۔ مساجد میں عموماً تین تین شب میں ہوتا تھا، غیر مساجد میں ایک یا دوشب میں بھی ہوجاتا تھا۔ ایک مرتبہ شاہ زاہد حسین صاحب مرحوم کے اصرار پر دوشب کے اندر قصبہ بہٹ میں ان کے مردانہ مکان میں قرآن پاک سنا کر آئے تھے، مسجد نواب والی قصاب پورہ دہلی میں ایک دفعہ قرآن سنانا مجھے یاد ہے، عزیز مولوی نصیر الدین سلمہ حکیم اسحاق صاحب مرحوم کی مسجد میں ایک مرتبہ قرآن پاک سنا رہے تھے، میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کسی سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے، حکیم اسحاق صاحب کی بیٹھک میں استراحت فرما رہے تھے، نصیر الدین کا چودھواں پارہ تھا، سامع بار بار لقمہ دے رہا تھا، وہ باوضو تھے، مسجد میں تشریف لے گئے، اور نصیر الدین کے سلام پھیرنے کے بعد مصلے پر سے ہٹا کر سولہ رکعات میں سولہ پارے ختم کردئے۔ مصلیوں کو تو گراں ضرور ہوئی، مگر لوگوں کو جلد قرآن پاک ختم ہونے کی خوشی مشقت پر غالب ہوا کرتی ہے۔ بارہویں رات کو قرآن پاک ختم کر کے سب تھکان بھول گئے۔ بعض اعزہ کے اصرار پر کاندھلہ میں بھی امی بی رحمہا اللہ کے مکان پر اخیر زمانہ میں ایک مرتبہ قرآن سنانے کا حال تو مجھے بھی معلوم ہے، اور وہ اپنی جوانی کا وہ قصہ سنایا کرتے کہ ساری رات نوافل میں قرآن سنانے میں گذرتی تھی اور چونکہ ہمارے یہاں نوافل میں چار سے زیادہ مقتدیوں کی اجازت نہیں ہوتی تھی، اس لیے مستورات تو بدلتی رہتی تھیں اور میرے والد مسلسل پڑھتے رہتے تھے۔ میرے چچا جان نور اللہ مرقدہ نے بھی کئی رمضان المبارک امی بی کی وجہ سے کاندھلہ گذارے، تراویح تقریباً ساری رات میں پوری ہوتی تھی، مسجد میں فرض پڑھنے کے بعد مکان تشریف لے جاتے تھے اور سحر تک تراویح میں چودہ پندرہ پارے پڑھتے تھے۔ مولانا رؤف الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ میرے والد صاحب کے حقیقی ماموں اور میری سابقہ اہلیہ مرحومہ کے والد، جن کا مفصل قصہ تو عنقریب تقویٰ کے مضمون میں آرہا ہے، اس کا یہ جزو یہاں کے مناسب ہے کہ تیس رمضان المبارک کو الف لام میم سے لے کر قل اعوذ برب الفلق تک ایک رکعت میں اور دوسری رکعت میں قل اعوذ برب الناس پڑھ کر سحر کے وقت اپنی والدہ یعنی امی بی سے یہ کہہ کر کہ: دو رکعات میں نے پڑھا دیں، اٹھارہ آپ پڑھ لے، اور ان کی والدہ امی بی نے سارا قرآن کھڑے ہو کر سنا۔ بات پر بات نکلتی جاتی ہے، مگر یہ واقعات بھی اکابر کے مجاہدات میں داخل ہیں، اس لیے زیادہ بے محل نہیں۔ [آپ بیتی، جلد دوم، ص ۱۰۴]

وفیات

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمہ اللہ کے خادم خاص جناب میر عشرت جمیل صاحبؒ

حضرت مولانا عبد الصمد صاحب مدظلہ (معاون مدیر: دار العلوم مدنیہ، بہاولپور) کی خالہ محترمہؒ

محترم جناب قاری منظور احمد مدنی صاحب (بہاول پور) کی والدہ ماجدہؒ

حضرت مولانا مفتی حسن صاحب مدظلہم کے خادم خاص مولانا قطب ولی صاحب کے والد صاحبؒ

قارئین سے جملہ متوفیان کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کی درخواست ہے۔

ابو مطیع

رجم کی مشروعیت اور اس کے منسوخ نہ ہونے کا اثبات

(......قسط نمبر۲......)

[رجم کے دلائل پر ایک نظر]

زنا کی سزا کے بارے میں نصوص مختلف ہیں مگر امت مسلمہ نے ہر زمانے میں یہی سمجھا ہے کہ زانی محصن کی سزا اسلامی حکومت میں رجم ہے۔ یاد رہے کہ دلائل منصوصہ کی دو قسمیں ہیں آیاتِ قرآنیہ، احادیث نبویہ۔ پھر حدیث نبوی کی تین قسمیں ہیں آپ کے ارشادات جن کو قولی احادیث کہتے ہیں، دوسرے آپ کے اعمال جن کو فعلی حدیث کہتے ہیں تیسرے تقریر یعنی آپ کسی کام کو دیکھ کر اس پر خوشی کا اظہار کریں یا خاموش رہ کر اس کی تائید کر دیں۔

(دلیل کی پہلی قسم: آیاتِ قرآنیہ)

[۱] سورۃ النساء میں فرمایا: **وَاللاَّتِی یَأْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُواْ عَلَیْهِنَّ أَرْبَعةً مِّنْکُمْ فَإِنْ شَهِدُوْا فَأَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوتِ حَتَّیٰ یَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلاً** (النساء:۱۵) یہاں یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ ایسی عورتوں کے بارے میں راستہ نکالے گا یعنی عنقریب ان کے بارے میں کوئی حکم آئے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے کوڑے اور رجم کی سزا کا حکم دیا چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کے تحت مروی ہے کہ عورت اگر زنا کرتی تو اسے گھر میں بند رکھا جاتا یہاں تک کہ مر جاتی۔ پھر اللہ نے اس کے بعد یہ آیت اتاری: **الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة** ،اور اگر وہ محصن ہوں تو ان کو رجم کیا جائے یہ وہ سبیل ہے جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کی، نیز فرماتے ہیں: **أَوْ یَجْعَلَ اللّٰـهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا** ''، کہ اللہ نے ان کے لئے سبیل بنا دی اور وہ جلد اور رجم ہے، عبداللہ بن کثیرؒ کہتے ہیں کہ فاحشہ زنا ہے اور سبیل حد ہے یعنی رجم اور جلد۔ (تفسیر طبری:۱۸۲/۴)

[۲] سورۃ النور میں ارشاد فرمایا: **الزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْکُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ إِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ** (النور:۲) اس میں زانی اور زانیہ کو کوڑے مارنے کا حکم ہے مگر یہ سزا اس کیلئے جو محصن نہ ہو محصن کی سزا رجم ہے جو احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔

مثال: ارشادِ باری ہے: وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلاثَةَ قُرُوْءٍ (البقرۃ:۲۲۸) اس سے پتہ چلا کہ طلاق یافتہ عورتوں کی عدت تین قروء ہے۔ طلاق کے بعد جب تک تین قروء نہ گزارے اس کا دوسری جگہ نکاح درست نہیں مگر ساری امت کے ہاں یہ حکم ہر مطلقہ کیلئے نہیں بلکہ دوسری آیات کی رو سے اس سے بہت سی مطلقات کا استثناء ہے چنانچہ جس کو رخصتی سے قبل طلاق ہو جائے اس پر کوئی عدت نہیں ارشادِ باری ہے: يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْآ إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيلاً (الأحزاب:۴۹) حاملہ کی عدت وضع حمل اور جس کو حیض نہیں آتا اس کی عدت تین قمری مہینے ہیں ارشاد فرمایا: وَاللّٰئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ إِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلاثَةُ أَشْهُرٍ وَّاللّٰئِيْ لَمْ يَحِضْنَ وَأُولاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا (الطلاق ۴) اس مضمون کو مرزائیوں نے بھی اپنی کتاب فقہ احمدیہ [۱/۱۰۰، ۱۰۱] میں لکھا ہے۔

دوسری مثال: قرآن کریم نے وضوء میں پاؤں دھونے کا حکم دیا مگر پاکی کی حالت میں موزے پہنے ہوں تو ان پر مسح کیا جا سکتا ہے اس کو مرزائی بھی تسلیم کرتے ہیں بلکہ وہ تو جرابوں پر بھی مسح کے قائل ہیں دیکھئے قادیانی گروپ کی کتاب فقہ احمدیہ [۲/۵۴، ۵۵ نیز ص ۵۸] پاؤں کا دھونا ضروری ہے اور خود شیعوں میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ائمہ وضو میں پاؤں دھوتے تھے ہاں حالت وضو میں موزے یعنی جراب پہن لی جائے تو پانچ نمازوں تک اس پر مسح جائز ہے اور وہ اس آیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی تفصیل ہے جس طرح زخم وغیرہ میں کسی عضو پر مسح کر لینا اس کے خلاف نہیں۔

(بیان القرآن: ۱/۱۴۱۰ حاشیہ ۷۹۳)

الزانية والزاني فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة کے ساتھ رجم کی حدیثوں کو یوں سمجھو جیسے وضو میں پاؤں دھونے کے حکم کو موزے کی حالت میں مسح کرنے پر جبکہ قرآن میں پاؤں دھونے کا حکم ہے مسح کا نہیں۔ تو جیسے موزوں پر مسح کرنے کی قرآن میں کوئی تصریح نہیں مگر احادیث کی وجہ سے مانتے ہو اسی طرح محصن کے رجم کو بھی صحیح متواتر احادیث اور امت مسلمہ کے تعامل سے مان لو۔

الغرض سورۃ النور کی یہ آیت عدت کی آیت کی طرح عام مخصوص منہ البعض ہے مکرہہ کی طرح ثیبہ کا استثناء ہے مکرہہ کو کوئی سزا نہ دی جائے گی اور ثیبہ کو رجم کیا جائے گا اور یا یوں کہا جائے کہ یہ آیت ہے ہی غیر محصن کے بارے میں اس میں ''الْ'' عہد خارجی کا ہے کیونکہ جس پر قرآن نازل ہوا اس سے زیادہ قرآن کو کوئی نہیں سمجھ سکتا ان کی قولی تفسیر اور دائمی عمل یہی ہے۔ ویدرأ عنها العذاب سے اگر ثیبہ ہے تو وہ مراد ہے

منسوخ آیت میں مذکور ہے

تیسری مثال: قرآن کریم نے نمازوں کا حکم دیا مگر نمازوں کا مفصل طریقہ تو قرآن میں نہیں ان کی رکعات کی تعداد قرآن میں نہیں۔ یہ تو فرمایا: **و اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ** (الجمعہ:۹) **و اذا نادیتم الی الصلوۃ** (المائدۃ:۵۸) مگر نماز کی اذان کے کلمات کا قرآن میں کہیں ذکر نہیں اگر اذان کے کلمات کو حدیث سے لے کر ان آیات کا معنی سمجھا جا سکتا ہے تو حدود کی آیات کی تفسیر کے لیے حدیث نبوی سے استفادہ کیوں درست نہ ہوگا؟ آنحضرت ﷺ نے نہ صرف یہ کہ قرآنی احکام کو سمجھایا بلکہ اپنے بابرکت زمانے میں ان کو صحیح طور پر نافذ کر کے دکھایا اگر یہی کہا جائے کہ ہر قسم کے زانی کی سزا کوڑے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی ﷺ کے زمانے میں اور خلفاء راشدین کے زمانے میں عوام پر ناحق ظلم عظیم ہوتا رہا ان کے مال اور ان کی عزت تو کجا ان کی جان بھی محفوظ نہ تھی دین کے نام پر ان کی جانوں سے کھیلا جاتا تھا اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ کا اپنا فرمان ہے: **أبغض الناس إلى الله ثلاثة ملحد في الحرم ومبتغ في الإسلام سنة الجاهلية ومطلب دم امرئ بغير حق ليهريق دمه** (بخاری: ۱۰۱۶/۲) غرض اسلام کے نفاذ کا سب سے اعلیٰ زمانہ نبی ﷺ اور خلافت راشدہ کا دور تو اس طرح معاذ اللہ تعالیٰ اللہ کے مبغوض بندوں کا دور بنتا ہے۔

[۳] یعنی قرآن کریم سے تیسری دلیل: وہ آیات جو یہودیوں کے واقعہ کی بابت نازل ہوئیں [جیسے سورۃ المائدۃ کی آیت ۴۱] کہ یہودی آپؐ کے پاس زانیوں کے بارے میں فیصلہ لینے آئے آپ نے تورات منگوا کر ان کے درمیان تورات کے مطابق رجم کا فیصلہ کیا، اس کو مرزائی مصنف نے بھی لکھا ہے دیکھئے [بیان القرآن مرزائی: ۴۲۴/۱ حاشیہ ۸۲۳]

یاد رہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں زنا کے جرم میں یہود کو سنگسار کرنے سے پہلے کوئی سنگساری کا واقعہ نہیں ہوا تھا کیونکہ اگر کسی صحابی کے رجم کا واقعہ ہو چکا ہوتا تو یہودی کبھی آپ کی خدمت میں یہ مقدمہ لانے کی ہمت نہ کرتے۔

[۴] ان کے علاوہ ایک اور آیت تھی جس کا حکم باقی ہے مگر اس کی تلاوت منسوخ ہے (بخاری: ۱۰۰۹/۲، مسلم: ۶۵/۲، ابوداؤد: ۲۵۹/۲) اس کا ذکر ان شاء اللہ بعد میں کریں گے۔

خلاصہ: یہودیوں کے واقعہ سے ہٹ کر دو طرح قرآن کریم سے رجم کی مشروعیت پر استدلال ہوتا ہے ایک تو اس اعتبار سے کہ قرآن میں ہے **او یجعل اللہ لھن سبیلا** اس کی جو تفسیر آنحضرت ﷺ سے منقول ہے اس میں رجم کی تصریح ہے اور اگر منسوخ آیت لے لی جائے تو اس کو بھی سب مانتے ہیں حنفی مالکی حنبلی

شافعی۔ پھر سب فقہاءِ اہل سنت اس کو مانتے رہے ہیں ہاں خوارج نے رجم کا انکار کیا اور آج بھی خوارج ہی رجم کے منکر ہیں۔ پھر خلفاء راشدین جن کی خلافت علی منہاج النبوۃ تھی ان کے زمانے کو دیکھیں سب نے یہ سزا جاری رکھی حضرت عمرؓ تو فرماتے تھے کہ قرآن میں یہ حکم نازل ہوا تھا۔

[رجم کے بارے میں قولی احادیث]

اس بارے میں بعض صرف قولی ہیں جن میں آپ نے ثیب زانی کی سزا بتائی اور بعض قولی ہونے کے ساتھ ساتھ فعلی بھی ہیں کہ آپ نے حکم دے کر اس سزا کو عملاً نافذ کروایا ذیل میں چند احادیث پر اکتفا کیا جاتا ہے۔[۱] حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **لا یحل دم امرئ مسلم الا باحدی ثلاث النفس بالنفس والثیب الزانی والتارک لدینه المفارق للجماعة** (بخاری:۱۰۱۶/۲، مسلم :۵۹/۲) [۲] حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا **الولد للفراش وللعاهر الحجر** (بخاری:۱۰۰۷/۲)''بچہ فراش کیلئے یعنی بچے کا باپ وہی ہوگا جس سے عورت کا نکاح ہے اور زانی کیلئے پتھر ہیں''۔ چونکہ شادی شدہ زانی ہی ایسا دعوی کرتے تھے کہ فلاں عورت کا بچہ میرا ہے میں نے اس سے غلط کاری کی تھی اس لئے ان کے بارے میں فرمایا کہ ان کو بچہ تو نہ ملے گا ہاں اس جرم کی سزا میں پتھر لگیں گے [۳] حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا: **خذوا عنی خذوا عنی قد جعل الله لهن سبیلا البکر بالبکر جلد مائة ونفی سنة والثیب بالثیب جلد مائة والرجم** (مسلم:۶۵/۲) اس میں شادی شدہ کیلئے رجم کے ساتھ کوڑوں کی سزا بھی مذکور ہے آپ ﷺ نے عملی طور پر شادی شدہ پر جس سزا کا نفاذ کروایا وہ صرف رجم ہے اس لئے جمہور ایسے مجرم کیلئے صرف رجم کی سزا کے قائل ہیں۔ اور جو رجم سے پہلے جلد کے قائل ہیں رجم کے بارے میں تو ان کا اختلاف نہیں اس لئے یہ بات پکی ہے کہ رجم کا مسئلہ اتفاقی ہے۔

[قولی کے ساتھ ساتھ فعلی اور تقریری احادیث]

[۱] حضرت ماعزؓ کے بارے میں آپ ؐ نے فرمایا: **اذهبوه فارجموه** (مسند امام اعظم ص ۱۵۷ تا ۱۶۱، (بخاری:۱۰۰۶/۲،۱۰۰۸)، مسلم :۶۶/۲، ۶۷، ۶۸، ۶۹) آپ نے جو حکم دیا اس کو نافذ کروایا، بخاری شریف ج ۲ ص ۱۰۰۷ میں میں ہے کہ آپ ؐ نے حضرت ماعزؓ کا جنازہ بھی پڑھایا، مسلم [۶۸/۲] میں ہے کہ آپ نے فرمایا: **استغفروا لماعز بن مالک) قال فقالوا غفر الله لماعز بن مالک قال فقال رسول الله** ﷺ : **لقد تاب توبة لو قسمت بین أمة لوسعتهم** . اس سے پتہ چلا کہ آپ

نے نہ صرف اپنے ارشاد سے اس سزا کو بیان کیا بلکہ اپنے اختیار سے اس کو جاری کروایا اور بعد میں اس پر رضا کا اظہار کیا۔اس طرح یہ صرف قولی حدیث نہیں بلکہ قول کے ساتھ ساتھ فعل اور تقریر بھی ہے۔

[۲] حضرت غامدیہؓ کے رجم کرنے کا حکم دیا اور ان کو رجم کروایا پھر اس پر ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر فرمایا، اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی (مسلم:۶۸/۲) اس طرح یہ بھی قول فعل تقریر کا مجموعہ ہے۔

[۳] ایک عورت کے ساتھ اس کے مزدور نے زنا کیا آپ نے مزدود کے لئے کوڑے اور جلاوطنی کا اور عورت جو شادی شدہ تھی اس کیلئے رجم کا حکم ارشاد فرمایا اور حضرت انیسؓ کو اعترافِ زنا کی صورت میں رجم کیلئے بھیجا اور انہوں نے اس سزا کو جاری کیا (بخاری:۱۰۰۸/۲،مسلم:۶۹/۲)

[۴] ایک عورت سے کسی نے زبردستی زنا کیا تو آپ نے صرف مرد کو سزا دی ایک روایت میں ہے کہ عورت نے جس مرد کو پکڑوایا جب اس کو رجم کرنے کا حکم ہوا تو ایک اور آدمی کہنے لگا یہ مجرم تو میں ہوں: آپؐ نے عورت سے فرمایا: **اذهبی قد غفر الله لک** اللہ نے تیری مغفرت کردی اور جو ناحق پکڑا گیا تھا اس کے بارے میں بھی اچھی بات فرمائی اور جو آدمی اس کے ساتھ برائی کر بیٹھا تھا اس کے رجم کا حکم دیا فرمایا: **ارجموہ** نیز فرمایا **لقد تاب توبة لو تابها اهل المدينة لقبل منهم**: (ترمذی:۱/۱۵۷طبع مکتبہ رشیدیہ دہلی) یہ روایت بھی قول فعل تقریر تینوں پر مشتمل ہے [۵] ایک انصاری بچی نے زیور پہنا تھا ایک یہودی نے اس کا سر پتھروں سے کچل کر اسے کنویں میں پھینک دیا وہ یہودی پکڑا گیا اس نے اپنے جرم کا اقرار کیا اس کو سزا کے طور پر بعض روایات میں ہے کہ رجم کیا گیا مگر بعض روایات میں ہے کہ پتھروں سے اس کا سر کچلا گیا جیسا اس نے کیا تھا (مسلم:۵۸/۲، بخاری: ۱۰۱۶/۲،۱۰۱۷) راجح یہی کہ رجم سے یہاں ارد گرد کھڑے ہو کر لوگوں کا پتھر مارنا مراد نہیں بلکہ اس کے سر کو کچل دینا ہی مراد ہے۔واللہ اعلم۔

﴿زنا کی قباحتوں پر ایک نظر﴾

جیسے بم کے پھٹنے سے ہر طرف چنگاریاں نکلتی ہیں، اسی طرح زنا سے ہر طرف گناہ نکلتے ہیں، انسان کی آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، دِل دماغ ہی نہیں بلکہ جسم کے تمام اعضاء اِس سے لذت پاتے ہیں، انسان کتنا ہی لذیذ کھانا کیوں نہ کھائے بعد میں اس کی لذت نہیں رہتی، کھانوں کا تصور انسان کو مزہ نہیں دیتا، جبکہ زنا تو اپنی جگہ، بدنظری انسان کے دِل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑتی ہے اور انسان سوچ سوچ کر مزا لیتا ہے۔زنا تو زنا ہے، اگر محض گندے خیال آنے لگیں تو دِل کا سکون خراب کردیتے ہیں، فلموں اور گیموں وغیرہ کی وجہ سے بچے تعلیم میں کمزور رہتے ہیں کیونکہ ان کا تعلیم میں دِل ہی نہیں لگتا۔

زانی مرد سے بچے کا نسب ثابت نہیں ہوتا:

کنواری لڑکی اگر اس کا ارتکاب کرے اور حمل ہوجائے تو زانی کا پتہ چلے یا نہ چلے بچہ تو ناجائز ہے۔زانی مرد تو اُس کا باپ نہیں کہلوائے گا،شادی شدہ عورت کو زنا سے حمل ہوجائے تو اور بھی بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں اول تو وہ اس کو چھپائے گی،اس کا ذکر نہ کرے گی اور اگر ذکر کر بھی دے تو اولاد کا نسب مشتبہ ہوجاتا ہے۔

زنا اور بے شمار گناہوں کا ذریعہ ہے:

زنا کیلئے لوگ شراب پیتے ہیں تاکہ وقتی قوت حاصل ہوجائے اور شراب خود حرام ہے،زنا کیلئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور انسان کے پاس حلال رقم اتنی نہیں تو وہ اس کام کیلئے ناجائز رقم اکٹھی کرتا ہے افسر ہے تو رشوت لیتا ہے،کوئی ڈاکہ ڈالتا ہے کوئی ملاوٹ کرتا ہے۔کوئی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے،کوئی سود لیتا ہے جوئے اور لاٹری کی کمائی انشورنس اور بانڈ کے انعام وصول کرتا ہے غرض زنا کی ایک قباحت تو یہ ہوئی کہ انسان کی کمائی حرام ہوجاتی ہے وہ جیسے حلال بیوی پر اکتفا نہیں کرتا رزق حلال پر قناعت نہیں کرتا۔

زنا میں دین وایمان کو نہیں دیکھا جاتا:

نکاح میں کفو کو دیکھتے ہیں دینداری کا لحاظ کرتے ہیں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جس سے نکاح کرنا ہے وہ نسب یا رضاعت یا مصاہرت کی وجہ سے محرم نہ ہو جبکہ زنا میں تو یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ جس سے منہ کالا کرنا ہے وہ مسلمان ہے یا کافر،موحد ہے یا مشرک۔اس کا کسی سے نکاح تو نہیں۔رخصتی کے بعد طلاق ہو تو عورت کو عدت گزارنا ضروری ہے اور زنا والوں کو ایسی کوئی پابندی نہیں ایک وقت میں چار سے زیادہ نکاح جائز نہیں اگر چار میں سے ایک کو طلاق دے دے تو جب تک وہ عدت میں ہے اور نکاح جائز نہیں زانی کو ایسی پابندیوں سے کیا غرض؟ وہ چاہے تو ہفتے میں سات مختلف عورتوں کے پاس جائے۔ایسا ہی حال زانیہ کا ہوتا ہے۔پھر زنا کرنے والا چاہے تو دو بہنوں سے منہ کالا کرے یا ماں سے بھی کرے تو اس کی بیٹی سے بھی جبکہ نکاح میں ایسا جائز نہیں بیٹی سے نکاح ہوگیا تو ماں حرام ہوجاتی ہے۔

زنا کو ناجائز کاموں کا ذریعہ بنایا جاتا ہے:

سنا ہے کہ بعض لوگ ٹیکس بچانے کیلئے یا کوئی ٹھیکہ لینے کیلئے یا ناجائز مطالبات پورے کروانے کیلئے افسروں کو لڑکیاں مہیا کرتے ہیں ایک آدمی نے بتایا کہ بعض اخبارات والے کمپنیوں سے اشتہار لینے کیلئے لڑکیوں کو بھیجتے ہیں تاکہ متعلقہ افسروں کو راضی کر کے ان سے اشتہار کی رقم وصول کریں۔ایک شخص نے بتایا کہ سکول پڑھانے والیاں اپنے سکیل کی ترقی کیلئے اسی طرح بعض لڑکیاں کالجوں کی اپنے پرنسپل کی رضا

حاصل کرنے کیلئے اپنی عزت کھو بیٹھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کی عزت کی حفاظت فرمائے آمین۔

زنا سے زوجین کا حق مرتا ہے:

پھر اگر گھر میں بیوی ہے تو خاوند زنا کے ساتھ اس کا حق ضائع کرتا ہے اگر بیوی ایسا کرے تو خاوند کا حق ضائع کرتی ہے زنا سے پیدا ہونے والی اولاد کا کوئی باپ نہیں غیر مسلم بغیر نکاح کے زانی کو بچے کا باپ مان لیں تو ان کی قسمت۔ ہم تو ایمان والے سے بات کر رہے ہیں بہر حال زنا سے پیدا ہونے والے بچے کا سارا بوجھ ماں پر ہوتا ہے اس لئے ایسی عورتیں یا حمل ہونے نہیں دیتیں اور یا حمل کو گرا دیتی ہیں اور اگر بچہ ہو ہی جائے تو اس کو مروا دیتی ہیں یا کہیں کوڑے میں ڈلوا دیتی ہیں۔

زنا قتل وغارت کا باعث ہے:

زنا نہ صرف کرنے والے کیلئے بلکہ پورے خاندان کیلئے بدنامی کا داغ ہوتا ہے سود لینا گناہ کبیرہ ہے مگر ایک آدمی کے سود لینے یا دینے سے دوسروں پر کچھ اثر نہیں جبکہ زنا سے اتنی رسوائی ہوتی ہے کہ بسا اوقات زانیہ یا زانی مخالفین کے ہاتھوں بلکہ اپنوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں، زنا کے مرتکب کو چونکہ اپنے شریک ِحیات پر اکتفا نہیں اس لئے زوجین کے دِلوں میں ایک دوسرے کی قدر نہیں ہوتی عورت کو پتہ ہے کہ خاوند چھوڑ دے تو کیا؟ اور بہت ملنے والے ہیں خاوند بھی عورت کے حقوق کا خیال نہیں کرتا وہ کہتا ہے میرے پاس اس سے بڑھ کر بہت سی عورتیں ہیں یہ ناراض ہو جائے تو کیا ہوا؟ اس لئے ایک دوسرے کیلئے مخلص نہیں ہوتے۔ اور ایک یہ مصیبت بھی آتی ہے کہ ایسے لوگ طلاق کے بعد بھی اکٹھے رہ لیتے ہیں۔ بلکہ اس کو کوئی عیب نہیں سمجھتے۔

زانی کو نماز روزے اور صدقہ زکوۃ کی توفیق نہیں ہوتی:

پھر رات کو دیر تک برائیوں میں لگے رہنے سے صبح کی نماز جاتی رہتی ہے بلکہ ایسے لوگ تو کم ہی کسی نماز کے قریب جاتے ہیں۔ زنا کی نحوست سے چونکہ حرام پیسہ آنے لگتا ہے اس لئے انسان مالی عبادات کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ صدقہ زکوۃ تو حلال مال سے قبول ہے حرام مال تو بغیر ثواب کی نیت کے بھی صدقہ کرنا ضروری ہے زنا کے مرتکب کو اول تو زکوۃ صدقہ کی توفیق نہیں اگر دے ہی دے تو بیکار اور اگر اس مال کو خرچ کرنا ثواب سمجھے تو اور برا کام۔

زنا سے نان نفقہ اور وراثت کے مسائل خراب ہوتے ہیں:

پھر زنا سے جو اولاد ہو اس کا خرچ کس پر؟ اگر عورت کو پتہ ہو کہ بچہ خاوند کا نہیں پھر اس کو خاوند کی طرف منسوب کرے اور اس سے ناجائز بچے کا خرچہ وصول کرے تو اس کی برائی میں کیا شبہ؟ غلط کاری خود کی

اورساری زندگی کا بوجھ دوسرے پر۔اگر بچہ معذور ہے نابینا ہے تو زانی تو فارغ ہے اورعورت کا شوہر زندگی بھر دوسرے کے بچے کا بوجھ برداشت کرتا ہے اگر بچی ہے تو اس کے لئے رشتے کی تلاش اور پھر شادی کے اخراجات بھی برداشت کرتا ہے پھر جب زانیہ کا شوہر فوت ہوتو زنا کا بچہ اس کی طرف نسبت کی وجہ سے اس کی وراثت سے حصہ پا کر اصل ورثہ کے حقوق خراب کرتا ہے پھر چونکہ بچہ حلال کا نہیں اس لئے اس کا مزاج بھی ویسا ہی ہوگا بڑا ہوکر وہ کس کو سکھ دے گا معاشرے پر بوجھ بنے گا۔

شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں فرق کی ایک وجہ یہ ہے کہ غیر شادی شدہ کو نکاح میں ایک حجاب سا ہوتا ہے لیکن اگر شادی شدہ ہے اوراس کا جوڑا پاس ہے پھر تو صاف بات ہے کہ کوئی عذر نہیں اوراگر جوڑا پاس نہیں طلاق یا وفات کی وجہ سے انسان اکیلا ہے تو بھی کنوارے کی نسبت اب دوسری شادی کیلئے کوشش آسان ہے دوسری شادی کرے زنا کے قریب تک نہ جائے۔واقعی شرک وکفر کے بعد سب سے بڑا گناہ زنا ہی ہے اور شادی شدہ کے زنا سے تو بالخصوص ہر طرف گناہ نکلتے ہیں تو جس طرح ایسے زانی سے ہر طرف گناہ نکلتے ہیں اسی طرح ایسے زانی پر ہر طرف سے پتھر برسانے کا حکم ہے۔اوراسی کو رجم کہتے ہیں۔(جاری۔۔)

☆......☆......☆......☆

اسوۂ حسینی:......[شیخ العرب والعجم حضرت مدنی رحمہ اللہ کا ایک مکتوب]

عزیزم!...... اِن احوال کی وجہ سے پریشان نہ ہو! واقعاتِ حقیقت کو تاریخ وار قلم بند رکھو اور صبر جمیل اختیار کرو! زبان کو بند رکھو اور آنکھوں سے دیکھو، کچھ نہ بولو! قدرت دیکھو کیا کرتی ہے۔وہ بے نیاز اور بے پروا بھی ہے اوراور سب سے زیادہ رأفت ورحمت والا بھی، اُس کا ظاہری ہاتھ بھی ہے اور خفیہ ہاتھ بھی، کچھ فکر مت کرو! کسی کو مت ستاؤ! والله معكم أينما كنتم ،اگر واقعات اور افواہات ستایا کریں تو حضرت رحمہ اللہ کی زندگی یاد کرو! اور اگر اِس پر بھی قلبی سکون نہ حاصل ہوتو مزار پر جا کر تھوڑی دیر بیٹھ کر ایک دو پارے پڑھ کر حضرت رحمہ اللہ اور دوسرے بزرگوں کو بخش دیا کرو!......سب کو زبان تھامنی، صبر جمیل کرنا، ادب کا لحاظ رکھنا، اپنے فرائض میں مشغول رہنا، اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنا، اپنے اسلاف کرام کے طریقے پر چلنا اور اُن سے توسل رکھنا چاہئے، زیادہ فکر مند نہ ہونا چاہئے، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کی اور ہماری امداد فرمائے اور اپنی خاص رحمت سے نوازے۔آمین، اُس کی آنکھیں بند نہیں ہیں۔

والسلام......ننگ اسلاف حسین احمد......۱۱ رمضان المبارک، ۱۳۶۱ھ

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ

مسلم ممالک پر سوویت یونین کی یلغار

اسلام کو مٹانے کے لیے ہر دور اور ہر زمانے میں باطل اور شیطانی قوتیں اپنی طاقت اور اپنے حربے آزماتی آئی ہیں۔ ماضی قریب میں سوویت یونین کے نام سے روس نے اسلام کے علمی وفقہی مراکز بخارا وسمرقند وغیرہ پر جس طرح یلغار کی اور وہاں سے اسلام اور شعائر اسلام کا نام ونشان تک مٹا دیا، یہ داستان عبرت ناک بھی ہے اور دردناک بھی۔ حضرت مفتی رفیع عثمانی صاحب مدظلہ نے اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ یہ لہو رنگ داستان بیان کی ہے اور روسیوں کے طریقہ واردات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ماضی کے پرانے اوراق سے اسے نکال کر سنّی مسلمانوں کی خدمت میں اسے پیش کیا جارہا ہے کہ ہم اپنے ماضی کے آئینے میں اپنے حال کا چہرہ دیکھیں، عبرت ونصیحت حاصل کریں اور اپنی چال کو درست کریں۔ ایک ایسی تحریر جسے ایک بار نہیں، بار بار پڑھنا، اور اس کی ایک ایک سطر پر رک کر اپنی قومی حالت کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

روسی کمیونسٹ ان تمام علاقوں پر بھیڑیے بن کر ٹوٹ پڑے تھے اور ۱۹۲۰ء میں خیوا اور بخارا پر بھی قابض ہوگئے تھے۔ قرآن کریم کی طباعت واشاعت اور دینی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی، ان تمام مسلم ممالک کا رسم الخط فارسی رعربی تھا، اس پر پابندی لگا کر روسی رسم الخط مسلط کردیا گیا تاکہ مسلمان اپنے ماضی سے اور موجودہ عالم اسلام سے بھی مکمل طور پر کٹ کر رہ جائیں۔ جن مسلمانوں کو ''اللہ'' کا نام لیتے دیکھا گیا، انہیں سب سے بڑا مجرم ''روحانی'' قرار دے کر حکماً حقوق شہریت سے محروم کردیا گیا، حج پر پابندی لگادی گئی، مسلم اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کے لیے یہاں بھاری تعداد میں روسیوں کو لاکر آباد کیا گیا۔ مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کرنے کے لیے کمزور ایمان والوں کے ضمیر خریدے گئے، بیشتر مساجد ومدارس کو منہدم، یا کلبوں، گوداموں، اصطبلوں، رہائش گاہوں اور تفریح گاہوں میں بدل دیا گیا۔ خال خال جو مسجدیں باقی رہ گئیں، ان میں اذانیں بند کردی گئیں، ان پر بھاری ٹیکس لگادیئے گئے، اور ان میں نماز پڑھنے والوں پر بھی ''نمازی ٹیکس'' لگایا گیا۔

جو باہمت مسلمان ٹیکس دے کر بھی مسجد آتے رہے انہیں ''سرمایہ دار'' قرار دے کر طرح طرح کی سزائیں دی گئیں۔ پھر وہ یا تو شہید کردیئے گئے، یا سائبیریا کے برفانی جہنم میں، جہاں درجۂ حرارت چالیس

منفی سیٹی گریڈ تک گر جاتا ہے، اس طرح جلاوطن کردیئے گئے کہ ان کے اہل خانہ کو کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ ان کا کیا ہوا......ان قیامت خیز حالات میں گنی چنی باقی ماندہ مساجد کا حال بھی اس کے سوا کیا ہوتا کہ:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

جب روسی یلغار ہوئی تو یہاں کے علمائے حق نے یہ طے کرلیا تھا کہ وہ مسلمانوں کو اس حالت میں کہیں چھوڑ کر جانے کے بجائے آخر دم تک یہیں کفر کا مقابلہ کریں گے۔ ہزاروں مجاہدین نے ان اولوالعزم علمائے ربانی کی قیادت میں پہاڑوں میں مورچہ زن ہوکر بارہ سال سے زیادہ عرصہ تک اپنی چھاپہ مار کاروائیوں سے کیمونسٹوں کا ناک میں دم کیے رکھا، ان مجاہدین کا جاسوسی نظام بھی عرصہ دراز تک کام کرتا رہا، جیسے ہی پتہ چلتا کہ آج فلاں شہر یا قصبے میں مسلمانوں پر شب خون مارا جائے گا، یا قیدی علمائے کرام کو برسرِ عام قتل کیا جائے گا، یہ وہاں بجلی بن کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے، اور بہت سوں کو جہنم رسید کرڈالتے۔

لیکن سوشلسٹ حکومت نے رفتہ رفتہ ہر علاقے میں علمائے سوء کی ایک بڑی کھیپ تیار کرلی تھی، جو کیمونسٹوں کو ''نجات دہندہ'' ثابت کرنے کے لیے زمین وآسمان کے قلابے ملاتے، مسلمانوں کو نت نئے فروعی مسائل میں الجھا کر آپس میں لڑواتے، اور علمائے حق کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے۔

نئی نسل کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر دین اور علمائے دین سے بیزار کیا گیا، علمائے حق پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے گئے، جو علمائے ربانی ان مظالم کا شکار ہوئے، ان کی تعداد ۱۹۴۰ء تک پچاس ہزار کو پہنچ چکی تھی۔ عوام میں سے بے شمار لوگ اپنی جان اور ایمان بچا کر افغانستان، ایران، ہندوستان، اور سعودی عرب وغیرہ کو ہجرت پر مجبور ہوگئے۔ میں نے بھی ایسے کئی مہاجرین اور ان کے بیٹوں اور پوتوں سے ملاقات کی اور خود ان کی زبانی ان کی بپتا سنی ہے......دارالعلوم کراچی میں بھی ان کی بڑی تعداد زیرِ تعلیم ہے۔

ایک مہاجر کی بپتا:

ایک سیدزادے جناب اعظم ہاشمی، جو کراچی یونیورسٹی میں غالباً استاد تھے، کبھی کبھی ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے پاس آیا کرتے تھے، اور ہم سے بھی محبت سے ملتے تھے، میری ان سے آخری ملاقات تقریباً ۱۹۷۲ء میں ہوئی تھی، جبکہ ان کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی، یہ اندجان (ازبکستان) کے ایک مشہور علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے۔

۱۹۳۱ء میں جب ان کی عمر صرف سولہ سال تھی، اور خاندان کے مرد تقریباً سب کے سب کیمونسٹوں کے ہاتھوں شہید ہوچکے تھے، انہیں اپنی بیوہ والدہ کے اصرار پر راتوں رات ہجرت کرنی پڑی، کیمونسٹ ان کے خون کے پیاسے تھے، اور والدہ کو بھی ''روحانی'' قرار دے کر تمام حقوق شہریت سے محروم کیا جاچکا تھا،

عالمہ فاضلہ ماں کی مامتا نے مجبور ہو کر اس لخت جگر کو ہمیشہ کے لیے یہ کہہ کر الوداع کر دیا تھا کہ:

''بیٹا! تم میرے بڑھاپے کا سہارا اور امیدوں کا مرکز ہو، مگر جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، تم وطن عزیز میں رہ کر ایک مسلمان کی حیثیت میں میری خدمت نہیں کر سکتے، میں تمہیں دین وایمان کی خاطر کسی آزاد ملک میں چلے جانے کا حکم دیتی ہوں''

اس رات لالٹین کی دھیمی روشنی میں انہوں نے اپنے سوئے ہوئے بے خبر چھوٹے بہن بھائیوں کا آخری دیدار کیا، بیوہ ماں انہیں ضروری نصیحتیں کرتی ہوئی گھریلو باغیچے کے کنارے تک آئیں اور آخری بار پیار کر کے رخصت کر دیا۔

یہ چند ہی قدم چلے تھے کہ پیچھے سے کچھ گرنے کی آواز آئی، مڑ کر دیکھا تو ماں بے ہوش پڑی تھیں، سخت پریشانی کے عالم میں بیٹے نے پانی کے چھینٹے دے کر ان کو آواز دی، ہوش میں آتے ہی ماں نے تلملا کر پوچھا: ''بیٹا! تم واپس کیوں آ گئے؟ خدا کے لیے اپنی منزل کھوٹی نہ کرو! فوراً روانہ ہو جاؤ!''

ماں کو چارپائی تک پہنچا کر یہ یتیم بہتی آنکھوں اور بوجھل دل کے ساتھ نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ مہینوں اسی ''ماوراء النہر'' کے شہروں، ''خوقند'' اور ''بخارا و سمرقند'' وغیرہ میں ڈرے، سہمے دربدر پھرتے رہے، لیکن یہ سرزمین اپنی وسعتوں کے باوجود مسلمانوں پر تنگ ہو چکی تھی، بالآخر کسی نہ کسی طرح دریائے آمو پار کیا اور ہجرت کر کے افغانستان اور وہاں سے ہندوستان آئے، پھر پاکستان بن جانے کے بعد کراچی آ کر مقیم ہو گئے......عمر بھر ہزار جتن کیے مگر نہ ماں اور بہن بھائیوں کو دیکھ سکے، نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا شہید کر دیئے گئے؟ کیونکہ سوویت یونین کے تمام مقبوضہ ممالک اور ریاستوں کو باہر کی دنیا سے کاٹ کر ان پر ایسا دبیز آہنی خول مڑھ دیا گیا تھا کہ اندر کی آواز باہر، اور باہر کی اندر نہیں جا سکتی تھی، ڈاک اور مواصلات کے سارے رابطے مستقل طور پر ختم کر دیئے گئے تھے۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات

افغانستان پہنچنے سے پہلے اس ہجرت کے سفر میں خود ان پر کیا کیا قیامتیں گذر گئیں، اور وہاں کے شہروں میں دربدر پھرتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں اور علمائے کرام پر کیسے کیسے لرزہ خیز مظالم کا مشاہدہ کیا، یہ سب کچھ انہوں نے اپنی چونکا دینے والی مختصر کتاب ''سمرقند و بخارا کی خونیں سرگذشت'' میں بیان کر دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۰ء میں مکتبہ اردو ڈائجسٹ سمن آباد لاہور سے شائع ہوئی تھی، اس وقت بھی میرے سامنے ہے۔

ان ریاستوں کی ماضی قریب کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں خاص طور پر کرنا چاہئے، اس سے معلوم ہوگا

کہ دشمن مسلمانوں کی کن کن کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر اور کن کن حیلہ سازیوں سے انہیں تباہ کرنے میں کامیاب ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہاں کی فضائیں جو صدیوں سے پانچوں وقت اذان کی دلکش صداؤں سے گونجا کرتی تھیں، ان پر مہیب خاموشی چھا گئی، جو علاقے صدیوں اسلام کے نور سے نہ صرف جگمگاتے رہے، بلکہ ان کی ضیاء پاش کرنیں دنیائے اسلام کو منور کرتی رہیں، ان پر مصائب و آلام کی وہ تاریک رات مسلط ہوگئی جس کی سحر کا انتظار کرتے کرتے وہاں کی کئی نسلیں دنیا سے رخصت ہو چکی ہیں۔

لیکن آفریں ہے وہاں کے مظلوم و مقہور مسلمانوں کے ایمانِ راسخ پر، کہ کفر وظلم کے ان اندھیاروں میں بھی انہوں نے ایمان کی شمع ایک لمحے کے لیے بجھنے نہیں دی، وہ نمازیں چھپ چھپ کر پابندی سے گھروں میں پڑھتے اور بچوں کو سکھلاتے رہے، قرآن کریم کے جو نسخے انہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر کسی طرح بچا لیے تھے، وہ عمر بھر ان کا سب سے بڑا قیمتی سرمایہ رہے، ستر سال کے اس طویل عرصے میں ان کے اوراق کتنے ہی بوسیدہ کیوں نہ ہو گئے، مگر ان کی تلاوت اور تعلیم کا سلسلہ گھروں میں چھپ چھپ کر جاری رہا۔ حدیث وفقہ اور اسلامی علوم وفنون کی جو کتابیں انہوں نے کسی طرح بچالی تھیں، ان کی بھی اپنی جان کی طرح حفاظت کی...... جو علمائے کرام کسی طرح زندہ بچ گئے تھے، انہوں نے دینی علوم کی تدریس کا سلسلہ راتوں کو خفیہ طور پر جاری رکھا۔ غرض دین وایمان کی اس بیش بہا پونجی کو، رخصت ہونے والی ہر نسل، آنے والی نسل کے ہاتھوں میں تھماتی، اور دلوں میں اتارتی رہی...... نتیجہ یہ ہے کہ الحمدللہ وہاں مسلمانوں کی آج بھی بھاری اکثریت ہے، علمائے کرام بھی موجود ہیں، مسلمانوں کی بڑی تعداد نماز، روزہ، اور اسلامی شعائر کی پابند ہے۔

حیرت میں ڈال دینے والے یہ ایمان افروز حالات مجھے ازبکستان، تاجکستان اور قرغیزیہ کے ائمہ مساجد کے اس وفد سے معلوم ہوئے جو حال ہی میں دار العلوم کراچی آیا تھا۔ جن آلام ومصائب کا سامنا وسط ایشیاء کے مسلمانوں کو کرنا پڑا، اور جس طرح کی قربانیاں دے کر یہاں کے مسلمانوں نے اپنے دین کی حفاظت کی، روس کے دیگر مقبوضہ ممالک کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں بھی مسلمان آج تک ان حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں، اور دنیا کو اپنے عزم راسخ سے بتا رہے ہیں کہ:

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرّ کلیم وخلیل

روسی کیمونسٹوں کا طریقۂ واردات:

وسط ایشیاء کی مسلم ریاستوں اور افغانستان میں روسیوں کا طریقہ واردات یہ تھا کہ انہوں نے اپنی

''فاتحانہ'' کاروائیوں کوعموماً تین مرحلوں میں ترتیب وارانجام دیا:

۱...... پہلے مرحلے میں انہوں نے غریب اور مفلوک الحال عوام کی حقیقی مشکلات ومصائب کارونارو کرسوشلزم اورکمیونزم کی ''غریب پروری'' کا سبز باغ دکھایااور باور کرایا کہ ہم کارخانوں کا مالک مزدوروں کو، اور زمینوں کا مالک کاشتکاروں کو بنانا چاہتے ہیں، ہمارا مقصد یہ ہے کہ مفلس عوام کے مصائب دور کیے جائیں، تعلیم عام کی جائے، عورتوں کے ''حقوق کی حفاظت'' اورقوموں کی ''خودمختاری کی حفاظت'' کی جائے۔ ہمیں دین ومذہب سے کوئی دشمنی نہیں، صرف سرمایہ دارانہ وجاگیردارانہ نظام کومٹانا چاہتے ہیں۔اس مرحلے میں انہوں نے مارکسی سوشلزم کواسلامی عدل وانصاف اورخلافت راشدہ سے مشابہت کے رنگ میں پیش کیا، اور یہ دھوکہ دینے کی منظّم کوشش کی کہ سوشلزم اسلام کے عین مطابق ہے۔اس منافقانہ مسلسل کاروائی سے انہوں نے سادہ لوح غریب عوام کی ہمدردیاں حاصل کرکے معاشرے اورسیاست میں اپنی طاقت بنائی اورکسی حدتک دیندار اورتعلیم یافتہ طبقہ کوبھی دام فریب میں پھانس لیا۔اس مرحلے میں وہ لینن کے بتائے ہوئے اس گر پرعمل کرتے رہے کہ ''مشرق میں مذہب کے دروازے سے آؤ''

۲......دوسرے مرحلے میں انہوں نے مسلم ریاستوں کے تعلیمی اداروں، سیاسی ونیم سیاسی تنظیموں، اخبارات ورسائل، فلموں، ادبی انجمنوں، اورشاعروں میں اپنے تربیت یافتہ مبلغین کوگھسا کراہم عہدوں پر فائز کرادیا، یہ تعلیمی اداروں سے طلبہ کو، اورذرائع ابلاغ سے عوام کوکبھی سوشلزم اورکمیونزم کا نام لے کر، اورکبھی نام لیے بغیراس کی تبلیغ کرتے رہے، اورنوجوانوں کی خاصی تعداد کوذہنی طورپرکمیونسٹ بناتے رہے۔

ڈراموں نظموں، افسانوں، اخباری کالموں اورتقریروں کے ذریعے پوری قوم کی ذہن سازی کی گئی، اس مقصد کے لئے مقامی حکمرانوں سے راہ ورسم بڑھا کراپنے لیے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل کیے گئے، ثقافتی پروگراموں کے نام پرنئی نسل کوفحاشی اورعریانی پرلگایا، جمہوریت کے نام پرعوام کوبے راہ روی، بے لگام آزادی، اورقانون شکنی پرمائل کیا، روسی رقاصائیں آنے لگیں، اخلاقی قدروں اورتہذیبی روایات کامذاق اڑایاجانے لگا، اورانہیں ''رجعت پسندی'' کانام دے دیا گیا۔

''اقتصادی امداد'' کے نام پرمقامی حکمرانوں اور پالیسی ساز افسروں کواللے تللے کرائے گئے اور ''دفاعی معاہدوں'' کے نام پران حکمرانوں کو بے وقوف بنا کراپنا تابع فرمان بنالیا، جب وہ اقتصادی اور دفاعی میدانوں اورسائنس وٹیکنالوجی میں خودکفالت کی راہ پرگامزن ہونے کے بجائے اس غیرملکی امداد پر انحصار کے عادی ہوگئے، توان سے قومی مقاصد، عوامی امنگوں، اورملکی ضرورتوں کے خلاف فیصلے کرائے گئے اوردوسری طرف سے ردّعمل کے طورپرسیاسی لیڈروں اورعوام کوحکومت کے خلاف اکسایا گیا، حکمران اپنی

عوام سے کٹتے اور اتنے ہی کمزور ہوتے چلے گئے۔

ساتھ ساتھ اسلامی عقائد اور دینی شعائر پر رکیک زبان درازیاں ہونے لگیں، علمائے حق کا کھل کر مذاق اڑایا جانے لگا، علمائے سوء کو ان کے مقابلے میں شہ دی گئی، اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا۔

ماضی کے مسلم حکمرانوں کی رنگ رلیوں کے بعض سچے، اور بہت سے من گھڑت قصے سنا سنا کر عوام کو ان کے ماضی اور دینی راہنماؤں سے بے زار کیا گیا، اور انہیں آپس میں کہیں فرقہ واریت کی بنیاد پر، اور کہیں لسانی، علاقائی یا نسلی عصبیتوں کی بنیاد پر طرح طرح سے لڑوا کر ملک کو بری طرح کمزور کر دیا گیا۔

۳......تیسرے مرحلے میں جب دیکھا کہ اندر کا میدان ان کی فوجوں کے لیے ہموار ہو گیا ہے، اور کسی بڑی مزاحمت کا خطرہ نہیں تو ان کے ٹینک اور لاؤ لشکر سارے وعدوں، معاہدوں اور سبز باغوں کو روندتے ہوئے اس ملک میں داخل ہو گئے اور سب سے پہلے ان نااہل حکمرانوں کا خاتمہ کیا جنہیں بے وقوف بنا کر وہ یہاں تک پہنچے تھے۔ ملک پر انتہائی جابر و قاہر ڈکٹیٹرشپ مسلط کر دی گئی۔

یہ ڈکٹیٹر عموماً اسی ملک کے وہ ضمیر فروش سیاسی لیڈر ہوتے تھے جنہیں اس مقصد کے لیے پہلے سے تیار کیا جاتا تھا، ان کے نام تو وہی مسلمانوں کے سے تھے جو ان کے مسلم آباء و اجداد نے رکھے تھے، لیکن عقیدے کے اعتبار سے جب تک انہوں نے اپنا کٹر کمیونسٹ اور خدا کا منکر ہونا ثابت نہ کر دیا انہیں یہ عہدہ نہیں دیا گیا۔ کارخانوں، دوکانوں اور زمینوں پر سوشلسٹ بیوروکریسی قابض ہو گئی اور اور مفلس عوام اور مزدور و کاشتکار جنہیں سبز باغ دکھا کر یہ خونی ناٹک رچایا گیا تھا، منہ تکتے رہ گئے، ان کا افلاس بڑھتا گیا، اب بسا اوقات سوکھی روٹیوں کو بھی ترسنے لگے۔ مذہبی آزادی، تنظیم سازی، سیاسی آزادی، اور پیشے کی آزادی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

جس مسجد یا مدرسے سے سوشلزم یا اس کی ڈکٹیٹرشپ کے خلاف آواز اٹھنے کا اندیشہ ہوا، اس پر بلڈوزر چلا دیئے گئے، جو ذرا بولا اسے ہمیشہ کے لیے غائب کر دیا گیا اور ساری وہ داستانیں دہرائی گئیں جن کی دہشت آج بھی ترمذ، فرغانہ، بخارا اور سمرقند کے کوچے کوچے پر چھائی ہوئی ہے۔

اس کے آبِ لالہ گوں کی خونِ دہقاں سے کشید
تیرے میرے کھیت کی مٹی ہے اس کی کیمیا
اس کے نعمت خانے کی ہر چیز ہے مانگی ہوئی
دینے والا کون ہے؟ مردِ غریب و بے نوا

افغانستان میں تیسرے مرحلے کا حشر:

روسیوں نے وسط ایشیاء کی مسلم ریاستوں کو تاراج کرنے کے فوراً بعد ہی افغانستان میں بھی اپنی واردات کا پہلا مرحلہ شروع کر دیا تھا، پھر دوسرے مرحلے کا بہت بڑا کام ظاہر شاہ کے دورِ حکومت (تا ۱۹۷۲) میں ہوا۔ اور اس کی تکمیل داؤد خان کے دور (تا ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء) میں ہوئی، اس وقت مسلمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد کو، جو علم دین سے نابلد تھی، کیمونسٹ بنایا جا چکا تھا اور وہی سرکاری تعلیمی اِداروں پر چھائے ہوئے تھے، اعلیٰ تعلیم و ''تربیت'' کے لیے چھانٹ کر ایسے نوجوانوں کو روس بھیجا جاتا تھا جو پہلے سے کیمونسٹ ہوں یا ان کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ کٹر کیمونسٹ بن کر واپس آئیں گے، ملک کے کلیدی عہدوں، سیاست اور فوج پر کیمونسٹ قابض ہو چکے تھے، اور وہ تمام کاروائیاں مکمل ہو چکی تھیں جو روسی ''دوسرے مرحلے'' میں انجام دیتے رہے ہیں۔

تیسرے مرحلے کا آغاز ''انقلابِ ثور'' کے نام سے کیا گیا، جس کا مقصد افغانستان کو مکمل طور پر ''بخارا اور سمرقند'' بنا دینا تھا، یہ انقلاب ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کو یہاں کی کیمونسٹ جماعت، ''خلق پارٹی'' کے مشہور کیمونسٹ لیڈر ''نور محمد ترکئی'' نے صدر داؤد خان کو قتل کر کے اور کرسیٔ صدارت پر قبضہ کر کے برپا کیا تھا۔

روس کا خیال تھا کہ افغانستان کو مکمل طور پر کیمونسٹ ملک کی حیثیت سے روسی ''سوویت یونین'' کا ''اٹوٹ انگ'' بنا دینے کے لیے نور محمد ترہ کئی، اس کی خلق پارٹی، اور ان کے روسی مشیر و ''ماہرین'' کافی ہو جائیں گے، اس لیے اس نے اپنی فوجیں اس موقع پر نہیں بھیجی تھیں...... چنانچہ ترہ کئی نے افغانستان میں کیمونسٹ انقلاب برپا کرتے ہی جو کارنامے فوری طور پر انجام دیئے، وہ یہ تھے:

۱......ملکی جھنڈے کا رنگ سرخ کر دیا......سرخ جھنڈا لہرانے کی ایک پروقار تقریب منعقد کی گئی۔

۲...... پندرہ ہزار مسلمانوں کو اپنے ابتدائی دنوں میں ہی شہید کر ڈالا، جن میں بہت سے علمائے دین بھی شامل تھے۔

۳......اسلام کی مخالفت میں کئی قوانین نافذ کیے۔

۴......مقابلے میں بولنے والے بہت سے مسلمانوں کی املاک ضبط کر لی گئیں......

۵......ریڈیو سے دینی پروگرام یکلخت بند کر دیئے گئے۔

۶......سرکاری تعلیمی اداروں سے اسلام، اور اس کے متعلق مضامین کو خارج کر کے سوشلزم اور کیمونزم کی تعلیم لازمی قرار دے دی گئی۔

۷......کاشتکاروں، مزدوروں اور خواتین پر ''اشتراکی ثقافت'' کے تربیتی پروگراموں میں شرکت

لازم کردی گئی۔

۸......اللہ تعالیٰ کے وجود کا علی الاعلان انکار کیا جانے لگا (نعوذ باللہ) کیمونسٹ لیڈر بھرے مجمع میں اپنا ہاتھ بلند کر کے مسلمانوں کو للکارتے کہ ''اگر تمہارا خدا موجود ہے تو میرا یہ ہاتھ نیچے کر کے دکھائے۔''

افغانستان میں مکمل طور پر کیمونسٹ حکومت مسلط ہو ہی گئی تھی، لیکن کیمونزم کو یہاں اسلام پر مر مٹنے والی اس غیور قوم سے واسطہ پڑا جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد سے آج تک ایک دن کے لیے بھی اپنے اوپر غیر مسلموں کی محکومی کا داغ نہیں آنے دیا......پھر یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی پڑوسی مسلم ریاستوں میں کیمونزم کے مظالم کا مشاہدہ پچھلی کئی دہائیوں سے کر رہے تھے......انہیں دھوکہ دینا ممکن نہ تھا......

یہاں کے بیدار مغز علمائے ربانی سوشلزم اور کیمونزم کو شروع ہی سے مسلم افغانستان کے لیے خطرے کی گھنٹی قرار دیتے چلے آ رہے تھے، اور جب ظاہر شاہ کے دور میں ''ثقافتی انقلاب'' کے نام پر اسلام کی بیخ کنی کے لئے منظّم کارروائیاں شروع ہوئیں تو انہوں نے آنے والے طوفان کو بھانپتے ہی اس کے خلاف جد وجہد شروع کر دی تھی......

نور محمد ترہ کئی کے اس ''سرخ انقلاب'' نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور چند ہی دنوں بعد یہاں کے علمائے حق کو اس کافر حکومت کے خلاف اعلان جہاد کرنا پڑا......ترہ کئی کی نام نہاد حکومت نے اس مقدس جہاد کو کچلنے کے لیے بھرپور جنگی طاقت استعمال کی، کابل کی مشہور عالم بدنام ترین جیل ''پل چرخی'' کے بلڈوزر رات دن اجتماعی قبریں کھودنے میں مصروف رہتے، جن میں بے گناہوں کو بغیر کفن کے دھکیل دیا جاتا تھا......

مسلمانوں کا جذبۂ جہاد ان مظالم سے اور بھڑک اٹھا، انہوں نے اپنی تابڑ توڑ گوریلا کارروائیوں سے تھوڑے ہی دنوں میں فوج کی یہ حالت کر دی کہ وہ ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں سے باہر نہیں نکلتی تھی، روس نے ترہ کئی حکومت کو نہتے مجاہدین کے ہاتھوں اس طرح سے بے بس ہوتے دیکھ کر ''خلق پارٹی'' ہی کے ایک اور کیمونسٹ لیڈر حفیظ اللہ امین کو آگے بڑھایا جو اس وقت وزیرِ اعظم تھا، اس نے ترہ کئی کو قتل کر کے کرسی پر قبضہ کر لیا، مگر چند ہی روز میں روسی حکام کو اندازہ ہو گیا کہ امین ان کا وفادار نہیں ہے، اس نے مجاہدین کے خلاف کارروئیاں کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا......

چنانچہ روس نے ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو ٹڈی دل افواج افغانستان میں گھسا دیں، جنہوں نے سب سے پہلے حفیظ اللہ امین کا خاتمہ کیا اور اس کی جگہ ''پرچم پارٹی'' کے مشہور کیمونسٹ لیڈر ''ببرک کارمل'' کو چیکوسلواکیہ سے لا کر کٹھ پتلی صدر بنا دیا۔

جب ببرک کارمل کئی سال تک روسی فوج کی بھرپور طاقت اور جدید ترین اسلحہ سے بھی جہاد کو نہ دبا سکا تو روس نے اسے بھی معزول کر کے اپنے چھٹے مہرے ''ڈاکٹر نجیب اللہ'' کو داؤ پر لگا دیا......اور اس کے بعد وہ سب کچھ ہوا جو دنیا دیکھ رہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ ''روسی واردات'' کا یہ تیسرا مرحلہ ہی تھا جو جہادِ افغانستان کا سبب بنا اور بالآخر روسی سامراج کے لیے پیغام موت ثابت ہوا۔ افغانستان کے غیور مجاہدین نے اپنے پندرہ لاکھ شہیدوں کا خون دے کر نہ صرف خود کو کیمونزم کی غلامی سے بچایا بلکہ وہ روس کی مقبوضہ مسلم ریاستوں میں بھی خفیہ طور پر اپنی جانوں پر کھیل کر پہنچے، انہیں اسلامی لٹریچر اور قرآن کریم کے نسخے پہنچائے، اور جہاد افغانستان کے منظر و پس منظر سے آگاہ کر کے ان میں آزادی کی بے تاب لہر دوڑا دی، بلکہ یہ کام ان فوجیوں نے بھی بڑے پیمانے پر انجام دیا جنہیں روس نے مقبوضہ ریاستوں سے یہ سمجھ کر بھرتی کیا تھا کہ یہ اپنے آبائی دین کو بھول چکے، اور کیمونزم کے سانچے میں ڈھل چکے ہیں......ان میں کچھ ایسے ضرور تھے جنہیں صرف اتنا یاد رہ گیا تھا کہ ان کے والدین مسلمان تھے، لیکن بڑی تعداد ان فوجیوں کی تھی جو در پردہ اب بھی اپنے دین پر قائم تھے......

ان فوجیوں نے جب افغانستان آکر مسلمانوں کے حالات، ان کی مظلومیت، ان کی نمازوں اور ایمان افروز جہاد کا مشاہدہ کیا تو ان کا بھی ایمان جاگ اٹھا، ان فوجیوں کی ہمدردیاں مجاہدین کے ساتھ ہو گئیں، بعض مواقع میں تو انہوں نے اپنا اسلحہ تک مجاہدین کی نذر کر دیا۔

روس نے یہ صورتحال دیکھتے ہی انہیں تو واپس بلا لیا تھا، لیکن جاگے ہوئے ایمان نے آزادی کی جو تازہ روح ان میں پھونک دی ہے، اس کا توڑ اب کسی کے پاس نہیں۔

افغانستان کی دلدل میں پھنس کر روس جس عبرت ناک معاشی بدحالی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا ہے، اور اس کی مقبوضہ ریاستوں میں صورتحال جس تیزی سے بدل رہی ہے، اس سے تو اب یہی مژدہ سنائی دیتا ہے کہ:

عام حریت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں! آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

درخواست دعا

امام اہل سنت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کے تلمیذ رشید و فرزند ارجمند و خلیفۂ مجاز، ہمارے عم محترم شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا عبدالقدوس خان قارن مدظلہم علیل ہیں۔ قارئین سے اُن کی درازیٔ عمر اور صحت یابی کے لیے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔ [احسن خدامی/حمزہ احسانی]

مولانا حافظ عبدالجبار سلفی

مولانا حافظ صلاح الدین یوسف صاحب کی خدمت میں!

(......قسط نمبر ۴......)

تقلیدِ مطلق، تقلید شخصی اور بوقتِ ضرورت اہل علم کی طرف مراجعت کی لفظی بھول بھلیوں میں مولانا صلاح الدین یوسف کچھ ایسے بھولے ہیں کہ انہیں نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا اور یہ متعدد اہل حدیث علماء کا المیہ ہے کہ انہوں نے جمود وخمود کا کوئی دائم التاثیر شربت پی رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ عام سی اصطلاحات بھی سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور ستم یہ ہے کہ وہ باوجود نفس اختلاف کو نہ سمجھنے کے اپنی صداقت کا ڈھنڈورا پیٹتے جارہے ہیں۔ حافظ صاحب موصوف نے اپنے مقالہ میں بنیادی طور پر تین بحثیں اٹھائی تھیں۔

ا:۔ علمائے احناف اور بالخصوص علمائے دیوبند اہل حدیث پر ’’کرم فرمائیاں‘‘ کرتے رہتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد اس رویہ میں شدت آئی ہے۔

۲:۔ تقلید شخصی منہج سلف کے خلاف ہے۔ ۳:عقیدہ حیات النبی کے متعلق اہل سنت کا نظریہ۔

ہم نے پہلی دو باتوں کا بقدرضرورت جواب قارئین کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اور جتنے اعتراضات مولانا صلاح الدین صاحب نے اٹھائے تھے ان کے مطابق وضاحت پیش کردی گئی ہے۔ جہاں تک ہماری ذہنی رسائی ہوسکی ہے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

ا......تقلید کے حوالہ سے مولانا صاحب عمر رسیدہ ہونے کے باوجود معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک بچپنے سے نہیں نکل سکے، وہ آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ ہم کس سے کس بنیاد پر اختلاف کررہے ہیں؟ ہمارا دعویٰ کیا ہے؟ اس پر دلائل کیا ہیں؟ اور مخاطب کو ہم نے جو موردالزام اور ہدفِ ملامت بنا رکھا ہے اس کی شرعی، علمی یا کم از کم اخلاقی حیثیت کیا ہے؟

۲......علمائے احناف کی ’’کرم فرمائیوں‘‘ اور دارالعلوم دیوبند کے قیام کے بعد اس میں شدت کا جہاں تک اعتراض ہے، ہم نے اس پر بھی بحث کردی ہے کہ مولانا صاحب اپنی تاریخ کو ہی پڑھ لیں تو انہیں درجنوں کے حساب سے علمائے اہل حدیث، فضلاءِ دارالعلوم دیوبند کی قطاروں میں کھڑے نظر آئیں گے۔ معلوم ہوا دارالعلوم نے شدت کو جنم نہیں دیا بلکہ ’’متشددین‘‘ کے لیے اپنے دروازے کھولے ہیں، انہیں علم وفضل کے دریا میں غوطے دیئے اور ’’اعتدال‘‘ کا آب شفاء مہیا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اکابر اہل حدیث کو

دیوبند کا ماحول میسر آیا وہ عموماً متعصب اور متشدد نہ رہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ پر طعن وتنقید کے چسکے نے ہمارے ان دوستوں کو صحابہ کرامؓ پر تنقید تک پہنچا دیا ہے۔ہم نے ابتداءِ مقالہ میں مولانا صلاح الدین یوسف کی کتاب ''خلافت وملوکیت کی شرعی حیثیت'' کا ذکر کیا تھا جو انہوں نے مولانا مودودی کے رد میں تحریر فرمائی تھی۔ مودودی صاحب اگر حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ پر برسے ہیں تو مولانا صلاح الدین صاحب حضرت معاویہؓ کے دفاع میں حضرت علیؓ پر پل پڑے۔ گویا دونوں حضرات نے اپنے دماغ پر سرخ مرچوں کا لیپ کر کے تحقیق کے میدان میں قدم رکھا۔ مزے کی بات ہے کہ جس طرح اہل حدیث حضرات تقلید کے دشمن ہیں اسی طرح مودودی صاحب بھی عملاً مقلد ہونے کے باوجود لفظ ''تقلید'' سے ایسے بھاگتے ہیں جیسے کوا غلیل سے۔ حالانکہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ ائمہ مجتہدین کو من جانب اللہ منتخب کردہ اوران پر اعتماد کرنے والوں کو مقلدین قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''إن الاجتهاد في الأحكام أقام الله له رجالاً اجتهدوا فيه حتىٰ حَفِظَ الله بهم على الأمة ماحفظ من الدين وغيرهم لهم تبع فيه، إما ستدل بهم وإما مقلدهم ''(منہاج السنۃ:۴/۱۳۳)

ترجمہ: احکام کے معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسے مجتہدین چن لیے ہیں جو بذریعہ اجتہاد ترسیلِ احکام کرتے رہے اوران کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بحقِ امت دین کی حفاظت فرمائی اور بعد والے لوگ ان کے تابع ہیں، یا تو ان سے استدلال میں، اور یا ان کی تقلید میں۔

عدم تقلید اور عدم اعتماد کا شاخسانہ ہے کہ ائمہ فقہاء کی بے ادبی ہمارے دوستوں کو صحابہ کرامؓ کی بے ادبی تک لے گئی ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب نے اپنی اس کتاب (خلافت وملوکیت کی شرعی حیثیت) میں اسی طرح جگہ جگہ سیدنا حضرت علیؓ کی پالیسیوں پر ظالمانہ جرح کی ہے جیسے مودودی صاحب حضرت عثمان غنیؓ کی پالیسیاں زیر بحث لاکر بزعم خویش تاریخ بیانی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔اس سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ مولانا صلاح الدین صاحب کی اس کتاب پر ذمہ دار علمائے کرام نے جو غلط اور غیر ذمہ دارانہ عبارات کی نشاندہی کی تھی انہوں نے وہ حذف کر کے صرف تائیدی اقتباسات شامل کتاب کر دیئے۔ مثلاً مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دام جدہم نے اپنے تبصرہ میں جہاں کتاب کی تحسین کی، وہاں تقریباً تین صفحات پر مشتمل تنقید بھی کی تھی جو ماہنامہ البلاغ کراچی مئی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا، اوراب تبصروں پر مشتمل کتاب ''تبصرے'' کے صفحہ ۲۴۴ تا ۲۴۸ شامل ہے لیکن تین صفحات کا تنقیدی مواد حذف کر کے ہمارے اہل حدیث مخدوم نے ایک صفحے کا تائیدی مواد کتاب میں شامل کر دیا۔ دفتر ماہنامہ حق چار یار کے ناظم جناب ماسٹر منظور حسین صاحب نے آج سے تقریباً بائیس (۲۲) سال قبل ''خلافت وملوکیت کی شرعی حیثیت'' کی کچھ عبارات جمع کر کے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دام مجدہم کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا تھا، ماسٹر صاحب کا مکمل مضمون اور حضرت مفتی صاحب کے دو جوابی مکتوب ملاحظہ فرمائیں:

جناب ماسٹر منظور صاحب کا خط:

عالی جناب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض ہے کہ کتاب ''خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت'' پر آنجناب کا درج ذیل تبصرہ پڑھ کر بڑی حیرانی ہوئی جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''مولانا صلاح الدین یوسف صاحب نے تحقیق وتفتیش کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ کتاب موضوع کی دوسری تمام کتابوں سے زیادہ جامع مفصل اور تسلی بخش ہے، ہم اس پیشکش پر مصنف کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔امید ہے کہ دوسرے علمی حلقوں میں بھی اس کتاب کو سراہا جائے گا۔'' (ماہنامہ البلاغ مئی ۱۹۷۱ء)

حالانکہ خلیفہ موعود حضرت علی المرتضیٰؓ کی بیعت وانتخابِ خلافت اور جنگ جمل میں مولف مذکور نے جو موقف پیش کیا ہے وہ جمہور اہل السنّت والجماعت کے مشہور ومقبول مسلک کے خلاف ہے، کیونکہ محققین اہل سنت ابحاث مذکورہ میں کتاب وسنت کی روشنی میں حضرت علیؓ کی آراء کو حق وصواب پر مانتے ہیں۔جبکہ مولانا یوسف صاحب حضرت علیؓ کی خلافت کی مرکزی پالیسی کو زیر بحث لائے ہیں جس پر ان کی حسب ذیل عبارات شاہد ہیں۔چنانچہ موصوف لکھتے ہیں کہ:

۱......حضرت علی کی خلافت بالکل اسی طرح برحق ہے جس طرح اس سے پہلے خلفائے ثلاثہ کی خلافت تھی، ہمارا مقصد ان کے انتخاب کی نوعیت واضح کرنا ہے کہ ان کے انتخاب کا فیصلہ ہنگامی حالات میں اولاً ان لوگوں کی کوشش کا نتیجہ تھا جن کا دامن کردار خون عثمانؓ کے چھینٹوں سے داغ دار تھا،اس میں اہل شوریٰ واہل بدر کا کوئی دخل نہ تھا نہ عام مسلمانوں کی آزادانہ رائے کا اس میں کوئی تعلق تھا۔(خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت:۲۲۰)

۲......حضرت علی کو جو خمیازہ بھگتنا پڑا اس کی اصل وجہ تو خود حضرت علیؓ کی اپنی پالیسی تھی کہ انہوں نے تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہی اہل الرائے کے مشورے کو نظر انداز کر کے قاتلین عثمانؓ کے اشارے پر حضرت امیر معاویہ کو معزولی کا فرمان صادر کر دیا، اگر حضرت علیؓ اصحابِ رسول کے مشورے کو نظر انداز کر کے قاتلین عثمانؓ کے اشارے پر حضرت امیر معاویہ کو فی الحال ان کے عہدے پر رہنے دیتے،ان سے افہام وتفہیم کے ذریعے اپنے مسائل اور باغیوں کی پیدا کردہ مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ پھر بھی وہ حالات پیدا ہو جاتے جس کو مولانا مودودی خمیازہ بھگتنے سے تعبیر کر رہے ہیں۔(ایضاً:۲۸۷)

۳......ان حالات میں حضرت علیؓ کے لئے بہتر صورت یہ تھی کہ وہ جنگی اقدام کی بجائے افہام وتفہیم سے کام لیتے، مدینے میں بیٹھ کر حضرت عائشہؓ،حضرت طلحہؓ وزبیرؓ کے پاس اپنا وفد بھیج کر مفاہمت

کی راہ تلاش کرتے، حضرت عائشہؓ وغیرہ نے اگر جذبات سے مجبور ہو کر ایک ایسا قدم اٹھایا تھا جسے علی نا مناسب سمجھتے تھے تو اس کا صحیح علاج یہ تھا کہ حضرت علیؓ خود ایسے اقدام سے اجتناب کرتے، نہ یہ کہ خود بھی جوابی کارروائی کر کے حالات کے سازگار ہونے کی رہی سہی امید بھی ختم کر دیتے، لیکن حضرت علیؓ نے اکابر صحابہ کرامؓ کے عدم تعاون کے باوجود ایسا قدم اٹھا ڈالا جسے اس وقت تک نہ اٹھانا چاہیے تھا جب تک کہ باہمی افہام وتفہیم کی کوشش ناکام نہ ہو جاتی یا پھر اہل مدینہ اور اکابر صحابہ آمادہ تعاون نہ ہو جاتے، ایک کی غلطی دوسرے کے غلط اقدام کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی، ہم مان لیتے ہیں کہ اہل جمل کا موقف صحیح نہ تھا لیکن یہ سوچنا چاہیے کہ وہ نہتے، بے اختیار اور بے اقتدار تھے، ایسے لوگوں کے جذبات میں اشتعال پیدا ہونا قرین قیاس ہے۔ حضرت علیؓ جیسے کچھ بھی تھے بااختیار اور صاحب اقتدار تھے انہیں آگ کے مقابلے میں پانی بن کر آنا چاہیے تھا نہ کہ آگ کے مقابلے میں آگ، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ دو آتشہ مل کر صد آتشہ کا منظر پیش کرتا، اہل جمل کے موقف کو یکسر غلط سمجھنے والوں کو اس بات کی وضاحت کرنی چاہیے کہ انہیں راہ راست پر لانے کے لئے کیا جنگ کے سوا اور کوئی حربہ، طریقہ یا صورت نہ تھی کہ پہلے اس کو آزما لیا جاتا بعد میں یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا؟ (ایضاً: ۳۲۵)

۴......جنگ جمل کے بعد مسلمانوں کو ایک اور جنگ سے کیوں دوچار ہونا پڑا؟ اس کی وجہ بھی بعینہ وہی ہے جو جنگ جمل کی تھی، پرامن راہ مفاہمت کو آزمائے بغیر بیک قلم اقدام لشکر کشی...... حضرت علیؓ اقدام لشکر کشی سے اجتناب کرتے تو ممکن تھا کہ دوسری جنگ سے سابقہ نہ پڑتا۔ دونوں مقامات پر حضرت علیؓ نے غلط اقدام کو روکنے کے لئے جو اقدام کیا اس کو بھی مشکل سے ہی صحیح قرار دیا جا سکتا ہے۔ (ایضاً: ۳۴۱)

۵......جنگ صفین کی تمام تر ذمہ داری حضرت علیؓ پر ہے، انہوں نے ہی اس کی ابتداء کی ہے، حضرت معاویہؓ کو بامر مجبوری مدافعانہ جنگ کے لیے تیار ہونا پڑا۔ (ص: ۳۵۵)

۶......اہل الرائے کے مشوروں کو نظر انداز نہ کیا جاتا یا متفقہ مشورے کے بعد کوئی قدم اٹھایا جاتا تو ممکن ہے حالات کا دھارا وہ رخ اختیار نہ کرتا جو مستقل ایک داستان خونچکاں بن کر رہ گیا۔ (۴۸۵)

۷......پرامن مفاہمت کا راستہ اپنے گردوپیش کی غیر شعوری گرفت کی وجہ سے انہوں نے اول روز سے ہی اختیار نہ کیا اس لئے یہ چیز ان کے دائرہ فکر سے باہر رہی اور اس پہلو پر انہوں نے غور وفکر کرنے کی خاص ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ (ایضاً: ۳۳۹)

۸......تاریخ کی بتلائی ہوئی اس حقیقت کو کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا کہ اس موقع پر حضرت علیؓ سے اس سیاسی تدبر کا ظہور نہیں ہوا جو ایک خلیفہ راشد سے متوقع ہو سکتا ہے۔ (ایضاً: ۳۴۸)

۹......منصب خلافت سنبھالنے کے بعد حضرت علیؓ نے سب سے پہلے یہی کام کیوں کیا؟ اس میں

آخر کون سی سیاسی وملی مصلحت تھی کہ حالات انتہائی ناساز گار ہیں خود خلیفہ اپنے آپ کو بے اختیار سمجھتا ہے، اہل الرائے مشورہ دے رہیں کہ حالات کے پرسکون ہونے تک عمال عثمانی کو بالعموم اور حضرت امیر معاویہؓ کو بالخصوص ان کے عہدوں پر بحال رکھا جائے تا کہ بگڑتے ہوئے حالات سدھرنے کے بجائے مزید خراب نہ ہوں، حضرت علیؓ بے شک اپنے اعلان خلافت میں حق بجانب تھے لیکن ان کو اپنے اس فیصلے کے لئے پہلے کوئی صحیح بنیاد فراہم کر لینی چاہیے تھی۔ حضرت معاویہؓ سولہ سترہ سال سے مسلسل اس اہم خدمت پر مامور چلے آرہے تھے ان کے خلاف کسی کو کسی قسم کی شکایت بھی نہ تھی، ایک معتمد علیہ اور وسیع اثر ورسوخ کے حامل گورنر کو ایسے موقع پر جبکہ ملک کو ایسے لوگوں کی اتنی شدید ضرورت تھی جتنی اس سے پہلے کبھی نہ تھی، بلا کسی معقول وجہ اور شکایت کے معزول کر دینا کہاں صحیح تھا؟ حضرت علیؓ کے اس فیصلے میں مشاورت اور روح جمہوریت کس حد تک کارفرما ہے اس کی وضاحت آج تک کوئی نہیں کر سکا اور نہ مولانا کر سکے؟ (ایضاً:۳۴۳)

۱۰...... ہماری نظر میں کسی عالم کا قول نہیں گزرا جس میں حضرت علیؓ کے اس اقدام کی تصویب کی گئی ہو اس کے برعکس ایسے اقوال ملتے ہیں جس میں اکابر علماء نے صراحت کی ہے کہ حضرت علی کو حضرت معاویہ کی بحالی کا مشورہ دینے والے صحابہؓ کی رائے درست تھی۔ (ایضاً:۳۴۹)

۱۱......اس رائے کی معقولیت سے کون شخص انکار کر سکتا ہے؟ بعد کے واقعات نے اس کی اصابت کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا۔ (ص:۳۴۹)

۱۲......حضرت معاویہؓ کا یہ مطالبہ کہ آپ خلافت سے دستبردار ہو جائیں تا کہ مسلمان آپس کے مشورے سے جس پر اتفاق کریں اسے خلیفہ بنالیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ کا یہ مطالبہ حالات کا طبعی تقاضا تھا، اس معاملے میں ان کے ساتھ اکابر صحابہؓ کی معقول تعداد بھی تھی لیکن حضرت علیؓ کی طرف سے اس مطالبے کو درخور اعتنا نہ سمجھا گیا بالآخر جنگ بھی ہو کر رہی، طرفین کے ہزاروں افراد اس جنگ میں کام آگئے۔ (ایضاً:۳۵۸)

۱۳......حضرت معاویہ حضرت علی کی خلافت کو آئینی طور پر صحیح نہ سمجھتے تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ صحیح طور پر خلیفہ بننے والا شخص ایسے حالات میں پچھلے گورنروں کو معزول کرنے میں اتنی عجلت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا، اس میں ضرور انہیں باغیوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے حضرت عثمانؓ کو شہید کیا ہے ایسے موقع پر گورنری سے دستبرداری باغیوں کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے مترادف ہے، حضرت معاویہ کا یہ نظریہ محض ظن یا تخمین پر نہیں فی الواقع حقیقت پر مبنی تھا۔ (ایضاً:۳۴۴)

۱۴......جب پوری مملکت میں مطالبہ قصاص کی آواز گونج رہی تھی تو حضرت معاویہ کے لئے بحیثیت گورنر شام عوامی آواز کو عملی اقدام دینے کے لئے وجہ جواز پوری طرح موجود تھی لیکن پھر انہوں

نے نہیں کیا بلکہ ان کو گورنری کی طاقت استعمال کرنے پر حضرت علیؓ نے مجبور کیا۔ (ایضاً: ۳۱۵)

۱۵......حضرت معاویہ خون عثمانؓ کا مطالبہ کر رہے تھے اور اس معاملے میں ان کے ساتھ بہت سے اکابر صحابہ بھی تھے پھر قصاص کا مطالبہ ایک طرح سے قرآنی مطالبہ تھا گویا یہ قرآن کی دعوت تھی۔ (۳۶۲)

۱۶......ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت علیؓ کی خلافت پر امت متفق کیوں نہ ہوسکی؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ امت کے سواد اعظم نے حضرت علیؓ کے فیصلے کو اس بناء پر صحیح نہیں سمجھا، اس معاملے میں قاتلین عثمان پیش پیش تھے، ان کی اکثریت نے خلافت علیؓ کو لوگوں کی نظروں میں مشکوک بنا دیا تھا، پھر حضرت علیؓ کے طرز عمل نے ان کے ریب و شک میں مزید اضافہ کر دیا، اتفاق کی تین صورتیں تھیں، تینوں حضرت علیؓ کی وجہ سے بروئے کار نہ آسکیں۔ ایک یہ کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ کے مشورے اور اصرار سے خلافت قبول نہ کرتے جب تک کہ جلیل القدر اصحاب رسول اور مختلف شہروں کے وفود اس تجویز کی تائید نہ کر دیتے۔ دوسرے زمام خلافت سنبھالنے کے بعد قاتلین عثمانؓ کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرتے اور مطالبہ کو فی الفور شرف پذیرائی بخش کر قصاص کا مطالبہ کرنے والوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے، تیسرے عمال عثمانی کی یک قلم معزولی کا حکم دینے کے بجائے حالات کے پرسکون ہونے تک جدید تقرری سے اجتناب کیا جاتا تو ممکن تھا کہ اس سیاسی تدبر سے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھال دیا جاتا لیکن افسوس کہ ان تینوں صورتوں میں سے کوئی بھی بروئے کار نہ آسکی، ان تینوں چیزوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ لوگوں کو شکوک و شبہات میں ڈالنے کے لئے کافی تھی لیکن جب لوگوں کے سامنے پے در پے یہ تینوں چیزیں آگئیں تو ان کی نظروں میں خلافت علیؓ کی جو حیثیت رہ گئی تھی اس کے پیش نظر ان کا جو طرز عمل غیر جانبدارانہ عدم تعاون اور بعض جگہ تصادم کی صورت میں نظر آتا ہے، اس کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ بنیاد یا کم از کم انہیں معذور ماننا پڑتا ہے۔ ان کا طرز عمل ردعمل تھا۔ حضرت علیؓ کے ان اقدامات کا جو اتفاق کی راہ میں اصل رکاوٹ تھے، اعتراض اگر ہوسکتا تو اس فعل پر جس کے ردعمل کے طور پر یہ سب کچھ ہوا، نہ کہ اصل فعل کو نظر انداز کر کے ردعمل پر۔ (ایضاً: ۳۰۷)

مسلک اہل سنت کے برعکس یہ ہیں مولانا یوسف صاحب کے اعتراضات قرآن کے چوتھے خلیفہ موعودہ حضرت علی المرتضیٰؓ کی خلافت راشدہ کی مرکزی پالیسی پر کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا، ایسا کرنا چاہیے تھا، جس پر آنجناب تائیدی تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ ''یوسف صاحب نے تحقیق و تفتیش کا حق ادا کر دیا اور یہ کتاب موضوع کی دوسری تمام کتابوں سے زیادہ جامع، مفصل اور تسلی بخش ہے''۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی المرتضیٰؓ کو خصوصی طور پر ''أقضاهم'' فرمایا ہے، کہ تم میں سے سب سے زیادہ اچھا فیصلہ کرنے والے علی ہیں اور اسی بناء پر اہل السنّت والجماعت کا یہی مسلک ہے کہ جنگوں میں حضرت علیؓ نے جو کچھ طرز عمل اختیار کیا وہ صحیح تھا اور اسی بات کی وضاحت آنجناب نے بھی اپنی مشہور و معروف تصنیف ''حضرت

معاویہؓ اور تاریخی حقائق" میں کی ہے۔ چنانچہ آپ تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حضرت علیؓ کی خلافت چونکہ نہایت مضبوط دلائل سے منعقد ہو چکی تھی اس لیے حضرت عائشہؓ یا حضرت معاویہ کا ان کے خلاف قتال کرنا بلاشبہ غلط تھا، اس لیے حضرت علیؓ کا ان سے جنگ لڑنا جائز اور برحق تھا، لیکن چونکہ حضرت عائشہؓ ہوں یا حضرت معاویہؓ، دونوں سے یہ عمل حضرت علی کی عداوت یا بغض کی وجہ سے نہیں بلکہ شبہ اور تاویل کی بنیاد پر صادر ہوا تھا اور بہر حال وہ بھی اپنے پاس دلائل رکھتے تھے جو غلط فہمی پر مبنی سہی لیکن دیانت دارانہ تھے، اس لیے اخروی احکام کے اعتبار سے ان کا یہ عمل اجتہادی غلطی کے ذیل میں آتا ہے، اس لیے ان پر طعن کرنا جائز نہیں"۔ [ص:۲۱۳۔]

"جنگوں میں حضرت علیؓ کا اجتہاد واقعتاً درست تھا۔ یہ ہے اہل سنت کا صحیح موقف، قرآن وسنت کے مضبوط دلائل، صحیح روایات اور صحابہ کرامؓ کی مجموعی سیرتوں پر مبنی ہے۔" [ص:۲۱۸۔]

سوال یہ ہے کہ قرآن وسنت کے مضبوط دلائل کے خلاف مولانا یوسف صاحب کی مذکورہ بالا عبارات کو جامع، مفصل اور تسلی بخش کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

والسلام......محتاج دعا......ماسٹر منظور حسین عفی عنہ، ساہی وال (سرگودھا)

۱۵ محرم ۱۴۱۴ھ، بمطابق ۵ جولائی ۱۹۹۳ء

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی......حضرت مولانا عبداللطیف صاحب جہلمیؒ کی یادیں

مذہبی غیرت تو آپ کے رگ وپے میں رچی ہوئی تھی، مذہبی معاملہ میں آپ کسی تعلق اور کسی شخصیت کی قطعاً پرواہ نہ کرتے اور بڑے سے بڑا خطرہ بھی مول لے لیتے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں درجہ حفظ میں پڑھتا تھا، یہ غالباً ۱۹۷۱ء کی بات ہے، ایک رات عشاء کی اذان ہو چکی تھی، کسی نے آ کر گنبد والی مسجد میں آپ کو اطلاع دی کہ نیا محلّہ جہلم میں مرزائیوں کا جلسہ ہو رہا ہے اور اسپیکر پر تقریر ہو رہی ہے۔ آپ نے فوراً مسجد کے اسپیکر پر اعلان کیا اور فرمایا کہ میں انتظامیہ کو خبردار کرتا ہوں کہ مرزائیوں کا جلسہ پانچ منٹ کے اندر بند کیا جائے ورنہ ہم وہاں پہنچنے والے ہیں، آپ کے اعلان نے شہر میں ہلچل مچا دی، کثیر تعداد میں لوگ گنبد والی مسجد میں جمع ہو گئے، پانچ منٹ کے بعد کسی نے بتایا کہ تقریر کی آواز اب بھی آ رہی ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر یہاں کیا کرتے ہو؟ اور آپ مسجد میں موجود سنّی مسلمانوں کو لے کر مرزائیوں کا جلسہ بند کرنے کے لیے روانہ ہو گئے، جب وہاں پہنچے تو مرزائی دروازے بند کر کے بھاگ چکے تھے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب پاکستان کے آئین میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار نہیں دیا گیا تھا۔

[مولانا نور اشرف صاحب، جامعہ حنفیہ جہلم، ماہنامہ حق چار یارؓ، حضرت جہلمی نمبر، ص:۲۴۴]

مولانا مفتی رب نواز حفظہ اللہ

زبیر علی زئی کا تعاقب

(......قسط:۲۷......)

زبیر علی زئی:

> چار علماء[۲۱۰] کے مقابلے میں درج ذیل علماء وغیر علماء[۲۱۱] سے ثابت ہے کہ مسئلہ پوچھ کر عمل کرنا تقلید[۲۱۲] نہیں:
> ابن[۲۱۳] الحاجب النحوی، جلال الدین المحلی الشافعی، علی بن محمد الآمدی، ابنِ ہمام، ابنِ امیر الحاج، محمد اعلیٰ تھانوی اور صاحبِ مسلم الثبوت[۲۱۴] وغیرہ[۲۱۵] (حوالوں کے لیے دیکھئے: دین میں تقلید کا مسئلہ) اور ظاہر ہے کہ جمہور[۲۱۶] کے مقابلے میں چند علماء کی بات مرجوح ہی ہے۔

جواب:

۲۱۰ امام رازی رحمہ اللہ کو ضعیف کہنا غلط ہے۔(دیکھئے حاشیہ: ۲۰۵)، وحید الزمان کی غیر مقلدیت کا انکار سینہ زوری ہے، حوالہ جات حاشیہ ۹۸۔۱۰۰۔۱۵۶۔۲۰۸ میں دیکھیں۔اور بٹالوی صاحب کی تصریح کے مطابق میاں صاحب آخر عمر تک تقلید پر قائم رہے، لہٰذا مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہنے والوں سے انہیں خارج کرنا درست نہیں۔پس مسئلہ پوچھنے کو تقلید قرار دینے والوں کے سات نام ہوئے۔اور وہ یہ ہیں۔امام رازی، میاں نذیر حسین دہلوی، ثناء اللہ امرتسری، محمد حسین بٹالوی، وحید الزمان، اسماعیل سلفی اور علامہ ابن تیمیہ۔ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سے حضرات نے مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہا ہے جیسا کہ آگے حاشیہ:۲۱۶ میں آرہا ہے۔

۲۱۱ ہم نے جن احباب کے حوالے پیش کیے ان کا عالم ہونا غیر مقلدین کے ہاں مسلّم ہے، لیکن علی زئی ان کے مقابلہ میں ’’غیر علماء‘‘ کے حوالے بھی پیش کر رہے ہیں حالانکہ علماء کے مقابلہ میں غیر علماء کی بات علمی میدان میں مرجوح ہوتی ہے۔علی زئی صاحب نے ایک جگہ طعنہ دیتے ہوئے لکھا:

’’مونگ پھلی استاد، پیالی ملا...کے حوالے پیش کرتے تاکہ حوالوں کی تعداد زیادہ ہوجاتی۔‘‘

(مقالات:۴۶۵/۵)

مگر یہاں وہ خود تعداد بڑھانے کے لیے علماء کے مقابلہ میں غیر علماء کے حوالے پیش کر رہے ہیں۔لیکن افسوس! کہ مقصود پھر بھی پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا کیونکہ مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔دیکھیے حاشیہ نمبر ۲۱۶۔

۲۱۲ مسئلہ پوچھنا بھی تقلید ہے اس پر مدلل بحث ہم حاشیہ...... میں کر چکے ہیں اور آگے حاشیہ ۲۱۶ میں بھی حوالہ جات مذکور ہوں گے، ان شاء اللہ۔ نیز اس حوالے سے مجلّہ صفدر شمارہ :۱۱ میں علی زئی صاحب سے متعدد سوالات بھی کیے تھے۔ تین سال کی مدتِ طویل گزر جانے کے باوجود میری معلومات کے مطابق نہ تو علی زئی صاحب ان کا جواب دے سکے اور نہ ہی کوئی دوسرا غیر مقلد۔

۲۱۳ ابن الحاجب سے صاحبِ مسلّم تک کے حضرات کی کتابیں میرے پاس نہیں، اس لیے مراجعت نہیں ہوسکتی۔ علی زئی صاحب ابن الحاجب اور آمدی کی عبارت اپنے حق میں نقل کررہے ہیں کہ مسئلہ پوچھنا تقلید نہیں۔ جبکہ غیر مقلدین کے ہاں شیخ الکل فی الکل کا لقب پانے والے میاں نذیر حسین دہلوی کی کتاب ''معیارالحق'' میں یوں لکھا ہے:

''غزالی اور آمدی اور ابن حاجب نے کہا کہ رجوع کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع اور مفتی اور گواہوں کی طرف (اسے) اگر تقلید قرار دیا جائے تو کچھ حرج نہیں۔'' [معیارالحق، ص:۷۳]

آمدی اور ابن حاجب تو مفتی کی طرف رجوع / مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہنے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو بھی تقلید قرار دے رہے ہیں۔ مذکورہ عبارت کو نقل کرنے کے بعد میاں صاحب نے لکھا:

''پس ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور مجتہدین کی اتباع کو تقلید کہنا جائز ہے۔''
[معیارالحق ص۷۳]

۲۱۴ علی زئی صاحب کی فرمائش کے مطابق مسلّم الثبوت کے حوالہ کے لیے ''دین میں تقلید کا مسئلہ'' رسالہ دیکھا تو وہاں عبارت کے آخری الفاظ یہ ہیں:

''لكن العرف على أن العامى مقلد للمجتهد، قال الإمام وعليه معظم الأصوليين لیکن عرف یہ ہے کہ عامی مجتہد کا مقلد ہے امام (امام الحرمین: من الشافعیۃ) نے کہا: اور اسی (تعریف) پر علمِ اصول کے عام علماء (متفق) ہیں'' [دین میں تقلید کا مسئلہ ص۸۔۹]

اس عبارت میں صراحت ہے کہ عام علمائے اصول کا اتفاق ہے کہ عامی کا مجتہد کی طرف رجوع کرنا تقلید ہے۔ عبارت میں مذکور لفظ ''عـلیــه'' کی ضمیر مجرور کا مرجع پچھلی عبارت ''عامی کا مجتہد کی طرف رجوع کرنا تقلید ہے'' ہے۔ مسلّم کی شرح فواتح الرحموت میں عبارت اس طرح ہے۔

''(قال الإمام)إمام الحرمين (وعليه معظم الأصوليين)

علی زئی صاحب نے یہ عبارت نقل کرکے اس کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے:

''امام الحرمین نے کہا: عام علمائے اُصول اِس پر ہیں (کہ یہ تقلید نہیں ہے)''.....[دین میں تقلید:۱۰]

امام الحرمین تو فرما رہے ہیں کہ عام علمائے اصول کے نزدیک عامی کا مجتہد کی طرف رجوع کرنا تقلید ہے، مگر علی زئی صاحب نے قوسین کے درمیان ''یہ تقلید نہیں ہے'' کا اضافہ کر کے امام الحرمین کی مراد کو بالکل اُلٹ دیا ہے۔

اہل علم پر تو علی زئی کی غلطی مخفی نہیں، البتہ عوام کے لیے غیر مقلدین کے ہاں معیاری سمجھی جانے والی کتاب ''معیار الحق'' کو پیش کرتے ہیں۔ معیار میں ''لکن العرف علی أن العامی مقلد للمجتهد، قال الإمام وعلیه معظم الأصولیین '' کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے۔

''لیکن مشہور یوں ہو گیا ہے کہ انجان مجتہد کا مقلد ہے امام الحرمین نے کہا کہ اسی قولِ مشہور پر بڑے بڑے اصولی ہیں۔'' [معیار:۷۳]

اس ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ بڑے بڑے علمائے اصول مشہور قول پر قائم ہیں اور وہ مشہور قول یہ ہے کہ انجان کا مجتہد کی طرف رجوع کرنا (مسئلہ پوچھنا) تقلید ہے، مگر علی زئی صاحب اس کا مطلب برعکس بتا رہے ہیں۔

اب یہ فیصلہ تو غیر مقلدین کریں گے کہ علی زئی صاحب کی یہ غلطی ان کی عربی کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہے یا جان بوجھ کر ہاتھ کا کرشمہ دکھایا ہے؟

۲۱۵ ابن الحاجب سے لے کر صاحب مسلّم الثبوت تک حضرات کی عبارات سے اپنا من پسند مطلب نکالنا درست نہیں جس کی چند وجوہ ہیں:

(الف)......علی زئی اعتراف کے مطابق اِس میں غیر علماء بھی شامل ہیں، جب کہ ہم نے جن کے حوالہ جات ذکر کیے تھے وہ سب کے سب آلِ غیر مقلدیت کے ہاں علماء شمار ہوتے ہیں۔

(ب)......اِن میں سے ابن الحاجب، آمدی اور صاحب مسلّم تسلیم کرتے ہیں کہ عامی کا مجتہد کی طرف رجوع کرنا تقلید ہے جیسا کہ حاشیہ ۲۱۴ میں گزر چکا ہے۔ لہٰذا اِن کے حوالوں کو اپنے حق میں سمجھنا بلا وجہ خوش فہمی ہے۔

(ج)......اِن سے متقدمین حضرات مثلاً امام شافعی اور امام طحاوی رحمہما اللہ تو حدیث کی پیروی کو تقلید کہتے ہیں۔ [دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۲۱]

خطیب بغدادی اور علامہ ابن عبد البر رحمہما اللہ مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہتے ہیں۔ [دین میں تقلید:۴۴]

اور علی زئی صاحب خود ہی لکھتے ہیں:

''متقدمین کے مقابلے میں متاخرین کی بات کب مسموع ہو سکتی ہے؟'' [نور العینین:۱۳۷ طبع ۲۰۰۶]

(د)......مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہنے والوں کی تعداد زیادہ ہے، جمہور یہی ہیں، حوالہ جات آگے حاشیہ:۱۱۶ میں آرہے ہیں اور علی زئی صاحب کو اقرار ہے کہ ''جمہور کے مقابلے میں چند علماء کی بات مرجوح ہی ہے۔'' [متن]

۲۱۶ مسئلہ پوچھنے کو تقلید نہ کہنے والے جمہور نہیں، جمہور کے ہاں تو مسئلہ پوچھنا تقلید ہے۔ ثبوت حاضر ہیں۔ مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہنے والے حضرات میں سے درج ذیل ۶ حضرات نے حدیث کی پیروی کو تقلید کہا ہے اور حدیث میں مسائل بھی ہوتے ہیں گویا مسائل میں کسی کی پیروی کرنا تقلید ہے۔

(۱)......امام شافعی رحمہ اللہ۔ [دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۲۱]

(۲)......امام طحاوی رحمہ اللہ۔ [دین میں تقلید کا مسئلہ ص ۲۱]

(۳)......صلاح الدین یوسف غیر مقلد۔ [تفسیری حواشی صفحہ ۱۵۶۵]

(۴)......ڈاکٹر سید سعید احسن غیر مقلد۔ [روشنی ص ۲۴] دیکھیے حاشیہ ۱۱۷

آلِ غیر مقلدیت کے شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین دہلوی صاحب لکھتے ہیں:

''تقلید رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی پر ضرور چاہیے۔'' [معیار الحق:۷۴]

امام آلِ غیر مقلدیت وحید الزمان صاحب اپنے نام نہاد اہلحدیثوں کے متعلق لکھتے ہیں:

''گویا ترکِ تقلید کے انہوں نے یہ معنی سمجھے ہیں کہ احادیث اور آثارِ صحابہ اور تابعین کی تقلید بھی ضروری نہیں ہے جس طرح چاہو قرآن کی تفسیر کرلو۔'' [لغات الحدیث:۱/۲۱ کتاب:د]

وحید الزمان صاحب احادیث، صحابہ اور تابعین کی پیروی کو تقلید کہہ رہے ہیں۔

مسئلہ پوچھنے کو تقلید کہنے والوں میں سے چند حضرات یہ ہیں:

(۵)......امام رازی رحمہ اللہ۔ [تفسیر کبیر:۲۷۲/۳]

(۶)......میاں نذیر حسین دہلوی۔ [معیار الحق:۷۴]

(۷)......ثناء اللہ امرتسری۔ [فتاوی ثنائیہ:۲۵۶/۱]

(۸)......محمد حسین بٹالوی۔ [اشاعۃ السنہ:۳۱۵/۱۱]

(۹)......وحید الزمان۔ [ہدیۃ المہدی:۱۱۲/۱]

(۱۰)۔(۱۱)......اسماعیل سلفی، علامہ ابن تیمیہ۔ [تحریک آزادی فکر:۲۳۰]

(۱۲)......حافظ ابن عبد البر رحمہ اللہ۔ [جامع بیان العلم وفضلہ:۱۱۴/۲]

(۱۳)......خطیب بغدادی رحمہ اللہ۔ [الفقیہ والمتفقہ:۶۸/۲]

ان دونوں کی عبارات علی زئی صاحب کے رسالہ ''دین میں تقلید کا مسئلہ صفحہ ۴۴''میں بھی منقول ہیں۔

(۱۴)امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

''قلد:التقلید قبول قول المجتهد والعمل به۔''[تهذیب الأسماء واللغات :]

انہوں نے شرح مسلم:۱/۴۵ میں کہا ہے کہ:احکام میں ائمہ دین کی تقلید کی جائے۔دیکھیے حاشیہ نمبر۱۔

(۱۵)حافظ ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وأما تقلید من بذل جهده فی اتباع ماأنزل الله وخفی علیه بعضه فقلد فیه من هو اعلم منه فهذا محمود غیر مذموم وماجور غیرمازور ۔[إعلام الموقعین:۲/۱۸۸]

اور بہرحال اس کی تقلید جس نے اپنی محنت کو اللہ کے نازل کردہ دین کی اتباع میں خرچ کیا ہے اور بعض مسائل اس پر مخفی رہ جائیں اور وہ ان میں اپنے سے زیادہ علم والے کی تقلید کرتا ہے تو یہ تقلید کرنا قابلِ تعریف ہے مذموم نہیں ہے اس پر اجر ملے گا گناہ نہیں ہوگا۔

(۱۶)......محمد گوندلوی غیر مقلد۔[الاصلاح:۱۵۸]دیکھیے حاشیہ ۱۱۹۔۱۳۲

(۱۷)......فضل حسین بہاری غیر مقلد۔[الحیات بعد الممات:۲۱۵]دیکھیئے حاشیہ:۶۹

(۱۸)......سخاوت علی جون پوری۔[اہلحدیث خدام قرآن:۱۸۸]دیکھیے حاشیہ ۱۱۹

(۱۹)......پروفیسر عبداللہ بہاول پوری غیر مقلد نے رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کے مسئلہ میں نام نہاد اہلحدیثوں کو مولویوں کا مقلد قرار دیا ہے۔[رسائل بہاول پوری:۸۳۱]دیکھیے حاشیہ ۷۳

(۲۰)......میر محمد ابراہیم سیالکوٹی غیر مقلد۔[تاریخ اہلحدیث:۱۴۶۔۱۴۷]دیکھیے حاشیہ ۱۵

(۲۱)......نواب صدیق حسن غیر مقلد۔[الدین الخالص:۵۱۵۔۵۶۶۔لقطۃ العجلان:۱۳۷]

(۲۲)......امام جصاص رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ان العامی علیه تقلید العلماء فی احکام الحوادث ۔بے شک عامی پر پیش آمدہ مسائل میں علماء کی تقلید ضروری ہے۔[احکام القرآن:۲/۲۱۵]

(۲۳)......علامہ آلوسی رحمہ اللہ۔[تفسیر روح المعانی:۱۴/۱۴۸]

(۲۴)......امام قرطبی رحمہ اللہ۔امین اللہ پشاوری صاحب غیر مقلد لکھتے ہیں:

''آپ نے بعض علماء کی کتابوں میں دیکھا ہوگا کہ تقلید واجب ہے جیسا کہ تفسیر قرطبی، جامع بیان العلم، اعلام الموقعین اور اسی طرح کتبِ فقہ و تفسیر وغیرہ ....آپ کو تعجب ہوگا کہ ایسا کیوں ہے؟ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ان علماء کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ایک عام آدمی کا کسی عالم سے مسئلہ پوچھنا اور اس عالم کے علم

سے فائدہ حاصل کرنا اس کو ان علماء نے تقلید کا نام دیا ہے۔'' [حقيقة التقليد وأقسام المقلدين: ۲۴۸]

(۲۵)......علی زئی صاحب کے استاد محبّ اللہ شاہ راشدی صاحب ایک مسئلہ ''رکوع کے بعد ہاتھ چھوڑنے پر'' بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ مسئلہ اب صرف دو پارٹیوں کا ایک امتیازی خاصہ اور ان کے کاروبار کا ٹریڈ مارک بن گیا ہے لہٰذا جو آدمی کسی ایک پارٹی کے ساتھ منسلک ہے وہ اسی طرح ہی کرتا رہتا ہے اگرچہ حقیقت میں اس کو اتنا علم وفہم بھی نہ ہو کہ وہ حسنِ امتیاز کرلیتا کہ یہ بات حق ہے محض اس بناء پر کہ ان کا اس پارٹی کے سربراہ کے ساتھ گہرا قلبی تعلق ہے اور اس کی بات کالنقش في الحجر بلکہ مثل وحی کے تصور کرلیتے ہیں اور آنکھیں بند کرکے تقلید کرلیتے ہیں اور دوسری طرف یا دوسرے فریق کے موقف کو شجرہ ممنوع تصور کرلیتے ہیں اور اس بات پر یقین کرلیتے ہیں کہ بس حق وہی ہے جو فلاں کرتا ہے یا جس پر فلاں عامل ہے اس کے سوا حق ہے ہی نہیں۔''

[مقالاتِ راشدیہ: ۱/۸۰]

راشدی صاحب نے نام نہاد اہلحدیثوں کے متعلق نہ صرف تقلید جامد کا اقرار کیا بلکہ انہیں مذموم تقلید کا عامل بتایا ہے کہ اپنے مولویوں کی بات کو ''مثل وحی'' سمجھ کے تقلید کرتے ہیں۔

راشدی صاحب نے رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کے مسئلہ میں نام نہاد اہلحدیثوں کو مولویوں کا جامد مقلد قرار دیا ہے لہٰذا اس عبارت سے ہمارا استدلال درست ہے کہ مسئلہ میں کسی کی پیروی کرنا ''تقلید'' ہے۔ علمائے اُمت اور غیر مقلدین کے ان حوالہ جات سے ثابت ہوا کہ مسئلہ پوچھنا بھی تقلید ہے۔

ہم نے یہ ۲۵ حوالے سرسری تلاش سے جمع کیے ہیں اگر محنت کریں تو اُمید ہے کہ اتنے یا اس سے بھی زائد مزید حوالے اکٹھے کرلیں گے، ان شاء اللہ۔ (جاری ہے۔۔۔۔)

''جو لوگ اخلاص کے ساتھ (تبلیغ میں [ناقل]) قربانیاں دیں گے، ان کی طرف ملک و مال والے ایک دن خود رُجوع ہوں گے، وہ وقت بڑی آزمائش کا ہوگا، اگر نظر ان کی حکومت اور دولت پر ہوگی اور یہ سمجھا گیا کہ اب ان کی دولت اور حکومت سے دین کا کام چلے گا تو یہ سب کیا دھرا برباد ہوجائے گا، اور اگر ان کے ملک و مال سے نظر ہٹا کر ان کو بھی قربانی کے راستے پر لگایا گیا تو ان سے بھی بڑے آجائیں گے......اُن کے ساتھ بھی یہی کرنا ہوگا، یہاں تک کہ حکومتوں کے صدور اور وزرائے اعظم آئیں گے، اُن کو بھی اسی راستے پر لگانا ہوگا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ دعوت وقربانی کا راستہ ہے، ملک و مال کا راستہ نہیں ہے۔''

[حضرت جی مولانا یوسف کاندھلوی رحمہ اللہ، حیات شیخ زبیر، ص: ۵۹۳]

احسن خدامی

مشاہدات بجواب شواہدات

(......قسط:۱۰......)

ایک وضاحت:

عم محترم جناب مولانا زاہدالراشدی صاحب کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل پر تنقید، اس کے جواب اور پھر جواب الجواب کا یہ سلسلہ حضرت مولانا عبدالرحیم چاریاری صاحب مدظلہم کی کتاب ''نوازشات'' سے شروع ہوا تھا، بہت سے احباب کے استفسار کے بعد یہ بات قارئین کی خدمت میں عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اس بحث کی بنیاد ''نوازشات'' تھی، لہٰذا ہمارے مضمون میں بھی اسی کے استدلال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، تاہم ''نوازشات'' کے مصنف کے دینی و ایمانی جذبہ کی قدر اور ان کے بنیادی اعتراضات واشکالات کو مبنی برحق سمجھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں اُن کے اندازِ تحریر اور طرزِ تکلم سے اختلاف ہے اور ہم اسے درست نہیں سمجھتے۔ نہ ہی یہ اندازِ تحریر حضرت امام اہل سنتؒ اور حضرت قائد اہل سنتؒ کے طرزِ تحریر کے مطابق ہے۔ ہم ان سے بھی امید کرتے ہیں کہ وہ ''نوازشات'' کے آئندہ ایڈیشن میں ایسے الفاظ و تعبیرات کو تبدیل فرمادیں گے۔

اس ضروری وضاحت کے بعد ہم اب دوبارہ اپنے مضمون کی طرف آتے ہیں۔

حضرت امام اہل سنت کے نظریات اور ''الشریعۃ'' کی پالیسی:

ماہنامہ ''الشریعۃ'' کے حضرات نے اپنی آزاد خیالی کی نسبت امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب رحمہ اللہ کی ذات اقدس کی طرف کرنے اور اپنے افکار وطرز عمل کو ان سے وابستہ کرنے کے لیے واقعات کی توڑ مروڑ اور حقائق کو مسخ کرنے کا جو افسوسناک سلسلہ شروع کیا گیا ہے اس پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ جناب عمار خان ناصر صاحب نے حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ کے نام خط میں بھی اس ''استدلال'' کو دوہرایا ہے کہ جناب مولانا زاہدالراشدی صاحب کی یہ ''آزاد فورم'' والی پالیسی امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر صاحب کے زمانے میں بھی تھی، مگر حضرتؒ نے نہ صرف اس پر عم محترم کو روکنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ انہیں اپنا جانشین بھی بنایا، لہٰذا معلوم ہوا کہ ''الشریعۃ'' کی اس آزادانہ پالیسی سے حضرتؒ بھی متفق تھے۔ بہتر ہے کہ سب سے پہلے ''آزاد تحقیق'' کے

بارے میں حضرت رحمہ اللہ کے چند فرامین وارشادات کو نقل کر دیا جائے تا کہ قارئین کرام خود ہی اندازہ لگائیں کہ حضرت رحمہ اللہ کی فکر کیا تھی اور ان کی جانشینی کے نام پر اُن کی طرف کیا منسوب کیا جارہا ہے۔ حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کے بارے میں ''الشریعۃ'' ہی کی اشاعت خصوصی سے چند واضح اور صریح حوالہ جات قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

۱......''آپ بخاری شریف کے سبق میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ بسا اوقات کسی مسئلے میں میرے ذہن میں ایسے ایسے دلائل آتے ہیں جن کو ذہن بھی قبول کرتا ہے، لیکن جب میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے اکابر کی تحریرات میں وہ نہیں ہیں تو میں بھی ان کو ترک کر دیتا ہوں۔ آپ کی یہ نصیحت تو ہر خاص و عام جانتا ہے کہ ''اکابر کا دامن کبھی نہ چھوڑنا'' وہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے اکابر نے ایسا کوئی موضوع نہیں چھوڑا جس پر انہوں نے کچھ نہ کچھ لکھا نہ ہو، فرمایا کہ ایک مسئلہ میں مَیں بڑا متردد تھا، کہیں سے مل نہیں رہا تھا، اچانک حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ملفوظات دیکھتے ہوئے مل گیا۔ اسی لئے فرمایا کرتے تھے کہ کہ ہمیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں، ہمارے لئے ہمارے اکابر ہی کافی ہیں۔[الشریعہ نمبر، بیادحضرت امام اہل سنتؒ،ص ۱۰۷، مولانا فیاض خان سواتی]

۲......''اسی لیے آپ اکثر یہ نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ:''میرے عزیزو! اکابر کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھنا! اکابر کی رائے پر اعتماد کرنا! جتنے فرقے پہلے گمراہ ہوئے ہیں، ان کی گمراہی کا نقطۂ آغاز اسی سے ہوا کہ انہوں نے قرآن وحدیث کے فہم میں اکابر واسلاف کی راہ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، خوارج و معتزلہ نے جب اکابر واسلاف کو چھوڑا ہے تو ٹھوکر پہ ٹھوکر کھائی ہے۔[ایضاً،ص:۱۵۵۔ مولانا محمد یوسف صاحب]

۳......''حضرت اپنی انفرادی رائے قائم نہیں کرتے تھے بلکہ سلف صالحین میں سے جس کی رائے کو دلیل کے لحاظ سے راجح سمجھتے اسی کو اپناتے اور جمہور کی رائے کو ترجیح دیتے تھے، اگر اہل علم میں سے کسی کی انفرادی رائے کسی مسئلے کے مطابق ہوتی تو اس کو تفرد قرار دیتے اور فرماتے کہ تفردات کی اتباع درست نہیں ہے، کئی دفعہ حضرت سے سنا کہ فرماتے تھے کہ ہر عالم کی انفرادی رائے کو تفرد نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ایسا عالم جو اپنے دور میں علمی لحاظ سے اس مقام پر ہو کہ اصول مسلمہ کی روشنی میں جدید مسائل میں اجتہاد اور فتویٰ کی اہلیت رکھتا ہو،، اس کی انفرادی رائے کو تفرد کہا جا سکتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور علامہ انور شاہ کاشمیریؒ جیسے حضرات اس کے اہل تھے، ہر مولوی کی انفرادی رائے کو تفرد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔[ایضاً:۱۲۸۔ حضرت مولانا عبدالقدوس قارن]

۴......''پاکستان میں بہت سے باطل فرقے ہیں، ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی، پارسی، رافضی، آغا خانی، قادیانی، بہائی، ذکری وغیرہ......آپ کسی سے پوچھ کر دیکھ لیں وہ یہی کہے گا کہ ہم راہِ حق پر ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں صحیح کر رہے ہیں۔ آپ ضابطہ یاد رکھیں! جو شخص یا جماعت قرآن وسنت سے ہٹ گئی، اجماع امت سے ہٹ گئی، وہ گمراہی کی وادیوں میں داخل ہو چکی، ہدایت قرآن کریم، حدیث مبارکہ اور اجماع امت میں ہے۔ ائمہ دین، فقہائے کرام، محدثین عظام کی تعلیمات سے الگ ہو کر کوئی دین سمجھنا چاہے تو میں یہی عرض کروں گا کہ ایں خیال است ومحال است وجنوں، ان بزرگوں نے دین کو سمجھا اور اس پر عمل کیا، ان کو چھوڑ کر کوئی دین کو نہیں سمجھ سکتا۔

[ایضاً ص:۱۴۷۔ مولانا محمد یوسف صاحب]

۵......''بدعت کتنا بڑا جرم ہے، اس کے متعلق آپؒ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ خدانخواستہ اگر ایک آدمی مسجد کی محراب میں بیٹھ کر سو بوتلیں شراب پی لے تو خود سوچیے کتنا بڑا گناہ ہے، لیکن یاد رکھیے کہ ایک بدعت کا گناہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، کیونکہ شراب پینے سے دین کا نقشہ بدل نہیں جاتا جبکہ بدعت سے دین کا نقشہ بدل جاتا ہے اور لوگ غیر دین کو دین سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔

[ایضاً ص ۱۵۷۔ مولانا محمد یوسف صاحب]

۶......''نیاز فتح پوری ملحد تھا، ایک مولوی کا بیٹا تھا، عربی ادب میں ماہر تھا، اور حساب میں بھی، لیکن گمراہ ہو گیا۔ اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ دعا کرو کسی مولوی کا دماغ خراب نہ ہو! اگر مولوی کا دماغ خراب ہو جائے تو فرعون سے بڑھ جاتا ہے۔[ایضاً ۱۵۸]

(یعنی کوئی شخص عالم کا بیٹا ہو یا خود بھی عالم بن جائے، عربی کا ماہر ہو اور امت کے اجماعی نظریات سے کھلواڑ کرنے لگے تو اب اسے دین میں قطع وبرید کی کھلی چھٹی نہیں مل جاتی، اور نہ ہی اس کا الحاد، اجتہاد کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔)

۷......''جنرل ضیاء الحق مرحوم کی صدارت کا آخری دور تھا، ۱۹۸۸ء میں انہوں نے ایک مشائخ کانفرنس منعقد کرائی اور اس کانفرنس کی صدارت کے لیے حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کو دعوت دی گئی، آپ نے انکار کر دیا، ایک دن صبح کے وقت حضرت مولانا عبدالقدوس خان قارن ہمیں مشکوٰۃ شریف کا سبق پڑھا رہے تھے کہ کمشنر گوجرانوالہ کا فون آیا اور اس نے کہا کہ ہوائی جہاز کے ذریعے حضرتؒ کے سفر کے تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں، اور ان کے ساتھ اور بھی جتنے آدمی جانا چاہیں، جا سکتے ہیں۔ حضرت شیخ اس وقت اسباق پڑھا رہے تھے، جب اسباق سے فارغ

ہوئے تو مولانا عبدالقدوس خان قارن صاحب مدظلہ نے کمشنر صاحب کا پیغام آپ تک پہنچایا، آپ نے جواب میں فرمایا: ''میں حضرت مدنیؒ کا شاگرد ہوں، تمہاری مشائخ کانفرنس میں نہیں جاؤں گا۔'' [روایت حافظ محمد مشتاق، ہرنولی، ایضاً ص ۱۶۲]

۸......''عوام الناس کو یہ بات پریشان کیے ہوئے ہے کہ جو بھی اسلامی یا منسوب باسلام فرقہ اپنے مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے تو قرآن و حدیث ہی کا نام لیتا ہے اور اپنے استدلال میں قرآن و حدیث ہی کو پیش کرتا ہے، اب ہم کس کو صحیح اور کس کو غلط، کس کو حق پر اور کس کو باطل پر سمجھیں، واقعی یہ شبہ اکثر لوگوں کے مغالطے کے لیے کافی ہے، لیکن اگر انصاف، خدا خوفی اور دیانت کے ساتھ اس بات پر غور کر لیا جائے کہ آخر یہی قرآن و حدیث حضرات صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ دین و بزرگان صالحین رحمہم اللہ کے سامنے بھی تھے، ان کا جو مطلب و معنیٰ اور جو تفسیر و مراد انہوں نے سمجھی وہی حق اور صواب ہے، باقی سب غلط اور باطل ہے۔ پس عوام کا یہ کام ہے کہ ہر باطل پرست اور خواہش زدہ سے یہ سوال کریں کہ فلاں آیت اور فلاں حدیث کی جو مراد تم بیان کر رہے ہو آیا یہ سلف صالحین سے ثابت ہے، اگر ثابت ہے تو صحیح، صریح حوالہ بتاؤ! چشم ما روشن دلِ ماشاد، ورنہ یہ مراد جو تم بیان کرتے ہو اس قابل ہے کہ اسے ؎ اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں......عوام اس قاعدے اور ضابطے کے بغیر کسی اور طرف نہ جائیں، پھر دیکھیں کہ حق کس کے ساتھ ہے اور قرآن و حدیث کی مراد کون سی صحیح ہے۔ [ایضاً ص: ۶۳۵]

۹......عموماً نام نہاد روشن خیال اور خود جناب عمار خان ناصر صاحب وغیرہ کی قبیل کے لوگ عوام الناس کو یہ بہلاوا دیتے رہتے ہیں کہ ہم اکابر و اسلاف سے صرف ''علمی اختلاف'' کرتے ہیں، ان کی توہین و تنقیص نہیں کرتے۔ بندہ کے والد گرامی اور حضرت کے فرزند ارجمند حضرت مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب نے ایک واقعہ کے ضمن میں اپنے اسی اشکال کو حضرت رحمہ اللہ کے سامنے پیش کیا، وہ کہتے ہیں کہ:

''میں نے بھی ذہن میں کافی عرصے سے کھٹکنے والا ایک سوال داغ دیا، کیونکہ موقع سے جائز فائدہ نہ اٹھانا بھی تو نعمت کی ناقدری ہے، میں نے پوچھا کہ جدت پسند طبقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم پر اکابر و اسلاف کی توہین و تنقیص کا الزام سراسر غلط ہے، ہم تو صرف ان سے رائے کا اختلاف رکھتے ہیں، اور اختلاف میں کوئی حرج نہیں، حضرت شیخ نے بڑے غصے اور جلالی انداز میں فرمایا: ''غلط کہتے ہیں، جھوٹ کہتے ہیں، اسلاف امت میں سے ایک ایک ہستی علم و فہم اور زہد و تقویٰ کے حوالے سے ایک منفرد اور بلند مقام رکھتی تھی، ہم تو ان میں سے کسی ایک کی رائے سے بھی اختلاف کی جسارت

نہیں کر سکتے، چہ جائے کہ پوری امت کے اہل علم وتحقیق ایک رائے پر متفق ہوں اور اس رائے سے اختلاف کیا جائے، اپنے علم وفن کو پوری امت کے اہل علم وتحقیق کے مجموعی علم وفہم سے برتر جاننا یا کم از کم ان کی برابری کی سطح پر دیکھنا، اس سے بڑھ کر ان کی توہین وتنقیص کیا ہوگی۔

[ایضاً، ص: ۶۴۱، مولانا عبدالحق خان بشیر]

ذرا گوش ہوش کے ساتھ حضرت رحمہ اللہ کے اس فرمان کو بھی سنا جائے کہ:

''میں نے تقریباً پچاس سال تک مختلف فکری واعتقادی اور فقہی واجتہادی مسائل پر تحقیق کی، اور تحقیق کے دوران بعض علمی وفقہی ایسے مسائل بھی میرے سامنے آئے جن کے بارے میں ذاتی تحقیق ومطالعہ کی بناء پر میری ذہنی رائے اکابرین اہل سنت کی تحقیقی رائے سے مختلف رہی، لیکن میں نے تقریری وتحریری طور پر کبھی بھی پبلک کے سامنے اپنی ان ذہنی آراء کا اظہار نہیں کیا، اس لیے کہ خود کو اکابر واسلاف کی علمی وتحقیقی سطح کے برابر لانے کا تصور بھی دل میں پیدا نہیں ہوا، ہمیشہ یہی سوچا کہ میری اس ذہنی رائے کے پیچھے تحقیق میں کوئی نہ کوئی کمی موجود ہے۔ اسی سوچ وفکر کے تحت ہمیشہ اپنے اکابر واسلاف کی تحقیقی آراء کو ہی اصح سمجھا، انہی کو دل وجان سے قابل قبول جانا اور انہی کی اتباع اور پیروی کو اپنے لئے باعث ہدایت ونجات سمجھا، بلکہ ان میں سے بعض مسائل ایسے بھی تھے جن کے بارے میں طویل مدت کے بعد تحقیقی طور پر ہی مجھ پر یہ منکشف ہوگیا کہ اس مسئلے میں بھی اکابر کی تحقیق ورائے ہی مدلل ومحقق تھی۔ میں نے جن دلائل پر اپنی رائے قائم کی تھی وہ تو ریت کا گھروندا تھے، اس لیے میں اپنے عزیز علمائے کرام اور طلبہ سے درخواست کرتا ہوں، ان کو نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے اکابر واسلاف کی اجماعی واتفاقی تحقیقات اور تعلیمات سے کبھی انکار وانحراف نہ کرنا اور نہ ہی کبھی جمہور اہل سنت کا دامن چھوڑنا۔ [ایضاً ص ۶۴۲، مولانا عبدالحق خان بشیر]

شاید ''صلح کلی'' دوستوں کے لیے حضرت رحمہ اللہ کا یہ پیغام بھی دوائے دل ثابت ہو کہ:

''اہل السنّت والجماعت کا مطلب، جیسا کہ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ نے غنیۃ الطالبین میں اور حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے منہاج السنۃ میں تصریح کی ہے: ''جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور حضرات صحابہ کرام کی جماعت کی پیروی اور اتباع کریں وہ اہل السنۃ والجماعۃ ہیں اور امت کے تہتر فرقوں میں سے یہی طبقہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اول وآخر تک دوزخ سے محفوظ رہے گا۔ اس فرقہ کو فرقہ ناجیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور آنحضرت کی صحیح حدیث ''ما انا علیہ واصحابی'' کا مصداق یہی طبقہ ہے اور ما انا علیہ سے مراد سنت اور واصحابی سے مراد جماعت صحابہ کی پیروی کی

طرف اشارہ ہے۔[ایضاً،ص:۶۴۹]

حضرت رحمہ اللہ نے اپنی ایک تقریر میں طلبہ کونصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''دوسری بات یہ کہ اپنے اکابر علمائے دیوبند کثر اللہ جماعتہم کا دامن نہ چھوڑنا......کبھی اپنی ذاتی رائے کو ذہن میں جگہ نہ دیں، اسی طرح اپنے اکابر سے ہٹ کر، کٹ کر، جو شخص بظاہر کتنی ہی معقول باتیں کرے، معقول نہیں، دھوکہ ہے، فریب ہے۔ ہر مسئلہ میں اپنے اکابر کے دامن کی طرف دیکھنا، ان کی طرف رجوع کرنا۔[ایضاً،ص:۷۳۸]

ماہنامہ ''الشریعۃ'' میں ہر قسم کے الّم غلّم لوگوں کی تحریرات بخوشی چھاپی جاتی ہیں اور ہر مسلمان کے سامنے مطالعہ کے لیے بے تکلف پیش کردی جاتی ہیں۔کیا حضرت رحمہ اللہ کی سوچ بھی یہی تھی اور کیا حضرت اس کو گوارہ کرنے کے قائل تھے؟ اور کیا حضرت کی صحت کے زمانے میں توہین رسالت اور مسجد اقصیٰ وغیرہ پر ''الشریعۃ'' کے یہ مضامین شائع ہوتے تو حضرت اپنی اولاد کو بھی ان کے مطالعے کی اجازت دیتے؟ حضرت مولانا عبدالحق خان بشیر صاحب کی زبانی حضرتؒ کی طرف سے ان کے بچوں کی تربیت ونگرانی کا یہ انداز اور اس کے ضمن ''آزاد فورم'' کے بارے میں حضرت کا نظریہ ملاحظہ فرمائیں کہ:

''تمام بچوں پر دیوبندی کتب ورسائل کے علاوہ باقی مذاہب ومسالک اور فرقوں کی کتب ورسائل کا مطالعہ کرنے پر سخت پابندی تھی۔حضرت شیخؒ کے پاس قادیانی، روافض، منکرین حدیث، اہل حدیث اور بریلوی وغیرہ تمام مکتب فکر کے رسائل آتے تھے لیکن سب بچوں کو ان میں سے دیوبندی مکتب فکر کے رسائل کے علاوہ کوئی رسالہ پڑھنے کی کسی کو اجازت نہ تھی۔[ایضاً،ص:۶۶۹]

اسی طرح حضرت رحمہ اللہ سے کسی شخص نے دیگر مسالک کی کتب پڑھنے کی جازت مانگی تو حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا:

''میرے نزدیک ایسے آدمی کے لیے جو اپنے مسلکی عقائد ونظریات اور اوران کے دلائل سے پوری طرح واقف نہ ہو، کسی دوسرے مذہب ومسلک کی کتب ورسائل کا مطالعہ کرنا جائز نہیں۔[۶۷۰]

اگر اس کے بعد بھی یہ حضرات اپنے ''آزاد فورم'' کا استناد حضرت رحمہ اللہ سے کرنا چاہیں تو اس مرض کا کیا علاج؟ خود جناب عمار خان ناصر صاحب ہی کی زبانی حضرت رحمہ اللہ کی اس بارے میں سختی اور بے لچک رویے کا ثبوت ملاحظہ فرمایئے! وہ لکھتے ہیں کہ:

''۲۰۰۱ میں الشریعہ میں میرے بعض مضامین شائع ہوئے، جن میں میں نے عبادات اور معاملات سے متعلق بعض فقہی مسائل کے ضمن میں حلقہ دیوبند کے معروف مفتیان کرام کے مؤقف

کے برعکس نقطۂ نظر کو علمی طور پر ترجیح دی تھی............خیر ابا جی نے ''الشریعہ'' میں میرے مضامین پڑھے اور مجھے طلب فرمایا، میں حاضر ہوا تو انہوں نے تنہائی میں محبت اور شفقت سے بھرپور لہجے میں گفتگو کی، فرمایا کہ دیکھو! جب زاہد نے سیاسی میدان میں قدم رکھا اور مختلف نظریات کے لوگوں اور جماعتوں سے ملنا جلنا شروع کیا تو ہمیں اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ وہ کہیں اپنے بزرگوں [یعنی اکابر دیوبند] کے مسلک سے ہٹ نہ جائے، لیکن الحمدللہ زاہد نے ہمیں اس معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا، اب تمہارے جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں تم نے بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو ہمارے بزرگوں کی تحقیق کے خلاف ہیں، جبکہ ان کی تحقیقات حد درجہ غور وفکر اور احتیاط پر مبنی ہوتی ہیں اور ان کے علم وفہم کے مقابلے میں میرے اور تمہارے علم یا رائے اور قیاس کی کوئی حیثیت نہیں، ابا جی نے اسی نوعیت کی چند مزید باتیں بھی ارشاد فرمائیں، ان کی باتیں دماغ کو تو جتنا اپیل کر سکتی تھیں اتنا ہی کیا، لیکن ان کے محبت وشفقت میں ڈوبے ہوئے لہجے نے سچی بات یہ ہے کہ دل کو جیسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، میرا ان سے بحث کرنے کا پہلے بھی ہرگز کوئی ارادہ نہیں تھا اور زیر بحث مسائل بھی بالکل جزوی اور فروعی نوعیت کے تھے، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ آپ جن باتوں کو غلط سمجھتے ہیں، ان کی نشاندہی کر دیں، میں ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں وضاحت کر دوں گا۔ ابا جی اس پر بے حد خوش ہوئے اور دعا دے کر مجھے رخصت کر دیا۔[ایضاً ۳۶۹، عمار خان ناصر]

جناب عمار خان ناصر صاحب نے سماجی تعلقات کی ویب سائیٹ ''فیس بک'' پر ''میں اور میرے بزرگ'' کے عنوان سے چند قسطیں لکھی تھیں جس میں اصل موضوع تو ''میں'' ہی ہے، ''میرے بزرگ'' صرف ''میں'' کی خدمت کے لیے گواہی کے کٹہرے میں قطار اندر قطار کھڑے ہیں۔ ان مضامین میں سے بھی چند اقتباسات قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہیں، جناب عمار خان ناصر صاحب زمانہ طالبعلمی میں عقائد اہل سنت سے اپنے انحراف کا ذکر کرنے اور اس پر اپنے چچا جناب رشید الحق خان عابد صاحب مدظلہ کی چشم پوشی سے اپنی حمایت کا تاثر دینے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''تاہم سب حضرات کا ظرف اتنا نہیں تھا، ہمارے ایک استاد محترم نے جو اس وقت مدرسہ نصرۃ العلوم میں مدرس تھے، باقاعدہ خط لکھ کر کشف وکرامات کے انکار اور فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین وغیرہ سے متعلق میرے نظریات کی شکایت ابا جی تک پہنچائی، ابا جی نے ان کا خط یہ نوٹ لکھ کر مجھے بھیج دیا کہ میں گمراہ لوگوں کے ساتھ میل جول نہ رکھوں اور اگلے دن مدرسے میں اسباق کے بعد ان کی خدمت میں حاضری دوں۔ یاد نہیں کہ ملاقات پر انھوں نے کیا کہا، لیکن جو کچھ فرمایا ہوگا، وہ واضح

ہے۔'' [میں اور میرے بزرگ، قسط۲]

یقیناً جناب عمار صاحب کے نزدیک وسیع الظرف ہونے یا نہ ہونے کا پیمانہ یہی ہے کہ جو شخص ان سے درگذر اور چشم پوشی سے کام لے وہ وسیع الظرف اور اعلیٰ اخلاق ہے، اور جو انہیں ٹوکنے، روکنے کی کوشش کرکے گستاخی کا مرتکب ہو، وہ کم ظرف اور پست خیال ہے، اور اس فتویٰ کی زد میں اگر خود حضرت رحمہ اللہ بھی آجائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ ''انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں گمراہ لوگوں کے ساتھ میل جول نہ رکھوں''، حضرت امام اہل سنت رحمہ اللہ کا یہ جملہ ''الشریعہ'' کی بنیادی ''آزاد فورم'' کی پالیسی پر ایک زبردست گرز ہے جو دھوکے، منافقت اور مداہنت پر مبنی اس پالیسی کو پاش پاش کر رہا ہے۔ جناب عمار خان ناصر صاحب ہی مزید لکھتے ہیں کہ:

''۲۰۰۲ء میں جب میرا انگریزی ادب میں ایم اے کے آخری سال کا نتیجہ آیا تو میں مٹھائی لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اباجی کو مٹھائی کا پس منظر بتایا تو انھوں نے غالباً مبارک دینے سے بھی پہلے یہ تنبیہی جملہ فرمایا کہ دیکھو، مودودی یا غامدی نہیں بننا۔'' [ایضاً قسط ۸]

حضرت رحمہ اللہ کے اتنے پیار، محبت اور شفقت سے بار بار سمجھانے کے باوجود جناب عمار خان ناصر صاحب کا اپنے ہی طرزِ فکر پر اڑے رہنا، متعلقین واکابر میں سے جو ذرا درگذر اور نرمی کا مظاہرہ کرے اسے جھٹ اپنا ہم نوا قرار دے دینا اور جو سمجھانے یا روکنے کی ذرا بھی غلطی کرے اسے بے تکلف کم ظرف اور سطحی ذہن کا تمغہ دے ڈالنا، یہ جناب عمار خان ناصر صاحب ہی کی قاتلانہ و دلبرانہ ادائیں ہیں، ہم تو کم از کم اس انداز استدلال اور ان تحقیقی اداؤں کی داد دینے سے قاصر ہیں۔

قارئین کرام کو بتاتے چلیں کہ حضرت رحمہ اللہ کی طرف سے تنبیہ کے یہ واقعات لکھ کر جناب عمار خان ناصر صاحب نے یوں اپنے حق میں استدلال کیا ہے کہ دیکھو حضرتؒ نے مجھے اکابر کے مسلک پر عمل کرنے کی تلقین تو کی مگر مجھے میرے طرز عمل سے ''روکنے'' کی کوئی کوشش نہیں کی، اور مجھے نصرۃ العلوم میں مدرس بھی مقرر کیا اور میرے ساتھ ہمیشہ شفقت بھی فرماتے رہے، وغیرہ وغیرہ...... حالانکہ جناب عمار خان ناصر صاحب کے ان مضامین ہی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی حضرت کی طرف سے انہیں تنبیہ کی جاتی تھی تو جناب عمار خان صاحب کی طرف سے فرمانبرداری و تواضع اور معروف الفاظ میں ''میسنے پن'' کا پورا پورا مظاہرہ کیا جاتا تھا جس کی بناء پر حضرت رحمہ اللہ کو یہی تاثر ملتا تھا کہ موصوف شاید اپنے طرز عمل پر نادم ہیں اور اس سے رجوع کر چکے ہیں۔ جناب عمار خان صاحب نے اپنے اس طریقہ واردات کا ان مضامین میں کافی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے جو کافی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے، مگر طوالت کے اندیشے سے

سردست ہم اسے کسی اور محفل کے لئے اٹھار کھتے ہیں۔

''الشریعۃ'' کی پالیسی کے بارے میں ان احباب کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ حضرت رحمہ اللہ کی صحت کے زمانے میں اسی طرح تھی جس طرح آج ہے، یہ دعویٰ سراسر غلط ہے۔ حضرت رحمہ اللہ کی صحت اور قوت کے زمانے میں ہرگز ان حضرات کو یہ جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ علی الاعلان اہل حق کی تحقیقات کو مجروح کریں، اگر ایسی کوئی پھس پھسی سی کوشش ہوئی بھی تو اس کا وہی حشر ہوا جس کا رونا اوپر جناب عمار صاحب نے رویا ہے۔ حضرت رحمہ اللہ تو باطل کی تردید کو فرض قرار دیتے تھے اور ان کا موقف تھا کہ جہاں کوئی شخص غلط بات کرے تو موجودین پر اس کی تردید فرض ہے، اگر کوئی بھی تردید نہ کرے تو سب گناہ گار ہوں گے، چنانچہ حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''اور مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کے خلاف، حدیث کے خلاف، آنحضرت ﷺ کے خلاف، حق کے خلاف اگر کوئی بات کرے تو مسلمانوں میں ضرور کوئی نہ کوئی طبقہ ہونا چاہئے جو ان کا رد کرے، اگر کوئی بھی رد نہیں کرے گا تو سب گناہ گار ہوں گے۔ اگر باطل کی ایک بھی ثقہ آدمی تردید کردے گا تو سب کی طرف سے فرض ادا ہوجائے گا کیونکہ باطل کی تردید فرض کفایہ ہے، کیونکہ اگر کوئی بھی تردید نہیں کرے گا تو عوام بڑے سطحی ہوتے ہیں، وہ اس کی بات کو صحیح سمجھ لیں گے۔ اس لیے اس کی غلط بات کی تردید کرنا ضروری ہے۔ [ذخیرۃ الجنان: ۱۴/۳۸۰]

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ:

> ''مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی اسلام کے خلاف بات کرے اور سارے مسلمان خاموش رہیں تو سب گناہ گار ہوں گے، اور اگر ایک بھی ذمہ دار اس کی تردید کردے تو فرض کفایہ ادا ہوجائے گا اور سب گناہ گار ہونے سے بچ جائیں گے''۔ [ذخیرۃ الجنان: ۱۴/۲۵]

لہٰذا یہ دعویٰ کرنا کہ حضرت رحمہ اللہ کے سامنے یہ حضرات حق و باطل کو ملتبس کرتے رہے اور حضرت اس پر راضی رہے، حضرت رحمہ اللہ پر عظیم بہتان ہے۔ ان حضرات کی یہ سرگرمیاں ۲۰۰۱ء کے بعد شروع ہوئیں، جب حضرت رحمہ اللہ کی شدید علالت کا آغاز ہوا، اور جس کے نتیجے میں حضرتؒ اٹھنے بیٹھنے، لکھنے اور مطالعہ کرنے بلکہ کروٹ بدلنے تک سے معذور ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود حضرتؒ کو جتنی بات کا علم ہوا، انہوں نے انہیں تنبیہ بھی فرمائی اور خاندان کے دیگر حضرات کو بھی حکم دیا کہ عمار خان صاحب کو سمجھائیں، مگر جناب عمار خان صاحب کی سینہ زوری کا یہ عالم ہے کہ جو شخص ان کے لیے ذرا سی بھی نرمی و رعایت کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ اسے اپنا ہم نوا بنا ڈالتے ہیں اور جو ایسے لہجے میں سمجھانا چاہتا ہے جو جناب عمار صاحب کی

طبع نازک کو ناگوار گذرے، تو اسے کم ظرف و تنگ نظر قرار دے کر دل کو تسلی دیتے ہیں۔ شاید نرمی کی دوا سے بعض لوگوں کو اثر نہیں ہوتا اور ان مزاجوں کو سختی و شدت کا نشتر ہی فائدہ دیتا ہے، حضرت شیخ رحمہ اللہ نے بھی غالباً یہی بات سمجھانے کے لیے اپنی گکھڑ تشریف آوری سے پہلے وہاں کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

''مجھ سے پہلے حضرت مولانا علم الدین صاحب جالندھری فاضل دیوبند یہاں خطیب تھے۔ موصوف کی طبیعت بہت نرم ہے، اس لیے گکھڑ جیسے بدعت گڑھ میں شرک و بدعت کے طوفان کا مقابلہ پوری طرح ان سے نہ ہوسکا''۔[الشریعہ، خاص نمبر، ص:۲۸]

معلوم شد کہ: ؎ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے (جاری ہے۔۔۔)

احسن خدامی

جامعہ مظہریہ حسینیہ جنہان سومرو (سندھ) کا سالانہ جلسہ

قائد اہل سنت، وکیل صحابہ، یادگارِ شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، حضرت اقدس حضرت مولانا قاضی مظہر حسین صاحب نور اللہ مرقدہ کے علمی و روحانی جانشین اور خلیفۂ مجاز حضرت اقدس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سومرو مدظلہ کے ادارہ ''جامعہ مظہریہ حسینیہ'' میں سالانہ جلسہ منعقد ہوتا ہے جس میں عوام اہل السنۃ والجماعۃ جوق در جوق شرکت فرما کر عقائد میں پختگی اور اعمال کی اصلاح کی انمول سوغات سے جھولیاں بھرتے اور دل کی کشت زار کو علمائے کرام کے قیمتی بیانات کی بارش سے سیراب کرتے ہیں، حضرت اقدس مدظلہ کے مریدین بھی ملک بھر سے جمع ہو کر دیدار کے جام سے خوب پیاس بجھاتے اور باطنی فیوض سے سیراب ہوتے ہیں۔ نیز درس نظامی سے فارغ ہونے والے طلبہ کو دستار فراغت سے نوازا جاتا ہے۔

حضرت اقدس مدظلہ کا گاؤں سندھ کے شہر ٹنڈو محمد خان سے سجاول کی طرف جانے والے روڈ پر برلب سڑک واقع قصبہ ''ڈتا واہ'' سے اندر کی طرف چند کلومیٹر پر واقع ہے۔ اور آبادی و رونق کے لحاظ سے اس ''واد غیر ذی زرع'' کے ایک کنارے پر ''جامعہ مظہریہ حسینیہ'' کی پرشکوہ عمارت دعوت نظارہ دے رہی ہے جو مسجد، لائبریری اور مدرسے کی دو منزلہ عظیم الشان عمارت پر مشتمل ہے، ساحل سمندر کے قریب ہونے کی بنا پر سمندر کی تند ہوائیں سارا سال مسلسل چلتی رہتی ہیں جن کی وجہ سے تقریباً سارا سال ہی یہاں موسم معتدل رہتا ہے، بلکہ شدید گرمی کے موسم میں بھی رات کو چھت پر کھیس کے بغیر سونا مشکل ہوتا ہے۔

اس سال بھی مؤرخہ ۲۳؍ مئی ۲۰۱۵ء کو حضرت کے گاؤں میں یہ پروگرام بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوا جس میں شرکت کے لیے جہاں آس پاس کے دیہات اور اندرون سندھ کے لوگ جوق در جوق شریک ہوئے وہیں پنجاب اور خیبر پختون خواہ کے مختلف علاقوں، صوابی، چارسدہ، گجرات، لاہور، اسلام آباد، چکوال، آزاد کشمیر، اوکاڑہ وغیرہ سے بھی بیسیوں افراد نے اس بابرکت پروگرام میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ ایک قافلہ لاہور سے قراقرم ایکپریس کے ذریعے روانہ ہوا جو پنجاب اور خیبر پختون خواہ کے تقریباً تیس افراد پر مشتمل تھا۔ جبکہ دیگر حضرات ذاتی گاڑیوں، دوسری ٹرینوں اور ہوائی جہاز کے ذریعے تشریف لائے۔ جلسہ کے موقع پر حضرت مدظلہ کے گاؤں کی رونق دیدنی تھی اور چاروں طرف تحریک خدام

اہل سنت کے سنی پرچم اپنی بہار دکھا رہے تھے، مدرسے کے طلبہ کرام اور مقامی حضرات بڑی مستعدی سے مہمانوں کی خدمت اور دیگر انتظامات میں مصروف تھے، حضرت اقدس خود بنفس نفیس مہمانوں کی ترحیب واکرام اوران کی راحت کے انتظام میں مشغول رہے۔ گاؤں کا منظر دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بڑے حضرت رحمہ اللہ کے زمانے کے بھیں جلسے کا منظر ایک بار پھر لوٹ آیا ہو۔

۲۳رمئی بروز ہفتہ، مغرب کے بعد جلسہ کا آغاز ہوا، تلاوت، حمد ونظم کے بعد حضرت مولانا اعزاز الحق صاحب (صوابی) کا بیان ہوا، پھر حضرت اقدس حضرت مولانا حبیب الرحمٰن سومرو صاحب مدظلہ نے بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا، حضرت کا علمی وروحانی بیان تقریباً سوا گھنٹے تک جاری رہا جس میں عقائد کے سورج سے باطل تلبیسات کے بادل چھٹتے نظر آئے، مشکلات کی گتھیاں سلجھتی چلی گئیں اور فیوض و برکات کا دریا اپنے جوبن پر بہتا رہا۔ حضرت اقدس کے بیان کے بعد اس سال مدرسہ سے فارغ ہونے والے طلبہ کرام کی دستار بندی کی گئی، پھر عشاء کی نماز ہوئی۔ اور نماز کے بعد رات گئے تک جلسہ جاری رہا جس میں مولانا عبد الغفور قاسمی صاحب، مولانا ظہور احمد علوی صاحب، مولانا عبد الغفور حقانی صاحب، اور مولانا ثناء اللہ صاحب کے بیانات ہوئے جبکہ دیگر شعراء کے علاوہ جناب مولانا قاسم گجر صاحب اور محمد علی گوہر صاحب بھی وقتاً فوقتاً اپنی نظموں سے سامعین کو گرماتے رہے۔ صبح ساڑھے تین بجے کے قریب یہ بابرکت پروگرام بخیر وعافیت اختتام پذیر ہوا۔ اللہ جل شانہ اس ادارے کو دارالعلوم دیوبند کی طرح علم تقویٰ اور جہاد کا مرکز بنائیں، اس کو اور اس کے متعلقین کو اپنی بارگاہ میں قبولیت عطاء فرمائیں، حضرت اقدس مدظلہ العالی کی صحت، عمر، علم اور تقویٰ میں برکت عطاء فرمائیں اور آپ کے فیوض و برکات کو پورے عالم میں عام وتام فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔ ☆☆☆☆

زنا کی حد کے لیے چار گواہوں کی شرط کا انکار کرنا کفر ہے

پہلے تو کہتے تھے کہ چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنا ظلم ہے، ڈاکوؤں کو سزا دینا ظلم ہے، اب کہتے ہیں کہ اس زمانے میں زنا کے لیے ایسے چار گواہ کہاں سے لائیں جو متقی ہوں۔ یہ بے ایمان قرآن میں ترمیم کرتے ہیں۔ بھائی! یہ کسی مولوی یا فقیہ کا مسئلہ تو نہیں ہے، یہ تو قرآن کا مسئلہ ہے۔ اگر تم چار گواہ نہیں مانتے تو کیا تم نے قرآن کو تسلیم کیا ہے؟ قطعاً نہیں! لہٰذا ایسے آدمی کو مسلمان سمجھنے والا خود کافر ہو جائے گا۔ یہ کھلا کفر ہے! اس کھلے کافر کو کافر نہ کہنے والا خود کافر ہو جاتا ہے۔

[امام اہل سنت حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ، ذخیرۃ الجنان: ۲۸/۱۴]

''فتنۂ غامدی نمبر''......علماء وقارئین کی نظر میں!

۱......جس اہتمام اور تفصیل کے ساتھ اِس فتنے کی سرکوبی اِس (فتنۂ غامدی) نمبر میں کی ہے، باطل کی تردید کے حوالے سے اِس کی مثال نہیں ملتی۔[شیخ الحدیث حضرت مولانا سلیم اللہ خان مدظلہ]

۲......الحمدللہ آپ نے دادا مرحوم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بروقت ایک عظیم فتنہ کی سرکوبی کے لیے قدم اٹھایا۔ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم میں اور زیادہ قوت دے کہ حق و باطل میں امتیاز کرتے رہیں، ''الفضل للمتقدم'' کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔[شیخ الحدیث مولانا مفتی عطاء الرحمٰن مدظلہ، بہاولپور]

۳......یقیناً یہ مجلّہ صفدر کی قابلِ قدر، فقید المثال علمی کاوش ہے، بلاشبہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی یہ اعلیٰ و بہترین جدوجہد ہے، اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت عطاء فرمائیں۔[مولانا زبیر احمد صدیقی، شجاع آباد]

۴......آپ یقین جانئے کہ کتاب ہر لحاظ سے بہت زیادہ پسند آئی، اکابر کے زریں اقوال، تجدد پسندوں کی شاطرانہ چالاکیوں سے پردہ کشائی، جناب غامدی صاحب کا تعارف اور مذموم اِرادوں اور اِس فتنے کا علمی تعاقب، اور اُن کی عبارات کی مضبوط گرفت اور فتاویٰ جات وغیرہ جیسے اہم مباحث پر مشتمل اِس کتاب کے متعلق یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب اِس موضوع پر ایک مثالی کاوش ہے۔

[مولانا کمال الدین المسترشد، کراچی]

۵.....مجلّہ صفدر کے ''فتنۂ غامدی نمبر'' کی جلد اول ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے معیاری ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ جلد اول کی طرح جلد ثانی بھی ظاہری و معنوی حسن سے آراستہ ہوگی۔

[مولانا عبیداللہ خالد، رئیس شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ فاروقیہ، کراچی]

۶......مجلّہ صفدر نے کما حقہ غامدی کے فاسد عقائد اور باطل نظریات کی تشخیص کی ہے۔

[مولانا مفتی گل حسن صاحب، دارالعلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ]

۷......ایک قاری کے لیے اتنی معلومات یکجا شاید ہی کسی اور جگہ سے حاصل ہوں۔

[مولانا نور حسین عارف، گوجرانوالہ]

۸......مجلّے کی انتظامیہ کا یہ جذبہ بھی قابل تعریف ہے کہ انہوں نے ۶۰۰ صفحات کے رسالے کی قیمت محض ۲۰۰ روپے رکھی ہے جو تقریباً لاگت کے برابر ہوگی۔[ماہنامہ البرہان، لاہور، جون ۲۰۱۵ء]

احسن خدامی

تعارف وتبصرہ......حیاتِ شیخ زبیر نور اللہ مرقدہ

ہمارے مخدوم ومحترم جناب مولانا سید زین العابدین صاحب ایک صاحب قلم عالم ہیں، اکابر کی سوانح سے انہیں خاص شغف ہے۔ اس سے پہلے ''تذکرۃ العطاء'' کے نام سے ان کی مرتب کردہ ایک کتاب پر تبصرہ بھی قارئین کرام مجلّہ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اِس وقت اُن کی کتاب ''حیات شیخ زبیر'' ہاتھوں میں ہے جو انہوں نے تبلیغی جماعت کی عالمی شوریٰ کے امیر حضرت مولانا زبیر الحسن کاندھلوی رحمہ اللہ کی سوانح کے طور پر مرتب فرمائی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے علمی حلقوں کا ایک دوسرے سے بالکل بے خبر رہنا اور ایک دوسرے کی عظیم دینی شخصیات سے ناآشنا رہنا اور ایک دوسرے کے اکابر کے حالات اور تصنیفات سے استفادہ سے محروم رہنا ایک المیہ ہے، بندہ کو یہ احساس پہلی مرتبہ اُس وقت ہوا جب انڈیا کے ماہنامہ ''ندائے شاہی'' کی حضرت مولانا اسعد مدنی رحمہ اللہ پر اشاعت خاص کا کسی جگہ اتفاقاً مطالعہ کا موقع ملا، مطالعہ کے بعد شدت سے یہ احساس ہوا کہ ایسی ایسی نادر ہستیاں، جو خود ہمارے اکابر کے سلسلے میں ہیں، موجودہ پرفتن حالات میں اُن کا ایک ایک قدم ہمارے لیے مشعل راہ ہے، اور ہم اُن کے حالات تو کیا، تقریباً اُن کے نام سے بھی ناآشنا ہیں۔ بہرحال مولانا زین العابدین صاحب نے اِس رجحان کو تبدیل کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا ہے، اللہ جل شانہ اس میں برکت عطاء فرمائیں۔

یہ کتاب صرف مولانا زبیر الحسن صاحب رحمہ اللہ کی سوانح نہیں بلکہ اِس دور میں پچھلے زمانوں کا نقشہ دکھادینے والی تبلیغی جماعت کی ایک مکمل تاریخ بھی ہے جس میں جناب مولانا زین العابدین صاحب نے اپنے درد وفکر میں ڈوبے ہوئے قلم سے اِس تحریک کی ابتداء، اور امیرِ اول، مجددِ دعوت حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ سے لے کر اَب تک کے امراء کی سوانح، نیز جماعت کی اب تک کی تاریخ بڑی وارفتگی کے ساتھ تحریر فرمائی ہے، جس کے پڑھنے سے انسان کے دل کو سوز کی دولت نصیب ہوتی اور ولولہ تازہ ملتا ہے۔ اِس طرح یہ کتاب صرف ایک شخص کی سوانح نہیں بلکہ ایک جماعت کی تاریخ بن گئی ہے۔

حضرت مولانا زبیر الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ کے حالات سے آگاہی کے لیے انڈیا کے حضرات

سے رابطہ ضروری تھا، اِس مقصد کے لیے مولانا زین العابدین صاحب نے جناب مولانا انیس احمد مظاہری صاحب کوواسطہ بنایا توانہوں نے فرمایا کہ:

''میری رائے یہ ہے کہ ہم آپ مل کر یہ کام اس طور پر کرتے ہیں کہ میں حضرت مولانا شاہد صاحب سے رابطے میں رہ کراُن سے معلومات حاصل کر کے آپ کوفراہم کرتا ہوں اور آپ اِس پر کام کریں، کتاب تیار ہونے پر میں اِس کو اپنے مکتبے سے چھاپ دوں گا۔''[ص:۳۳]

سیدزین صاحب نے اِس پر آمادگی کا اظہار کیا اوراس کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ کے نواسے جناب مولانا شاہد سہارنپوری صاحب سے رابطہ ہوا تو انہوں نے بہت شفقت فرمائی، حوصلہ افزائی کی، موادفراہم کیا، مقدمہ تحریر فرمایا، مکمل کتاب پر نظر ثانی فرمائی اور پھر نظر ثانی کے دوران جب ٹائٹل پر اپنا نام دیکھا تو فرمایا:

''اِس کی ضرورت نہیں، احقر یہ کام للہ فی اللہ کرنا چاہتا ہے''[ص:۴۰]

اللہ جل شانہ مولانا سیدزین العابدین صاحب کی اِس کاوش کوقبول فرمائیں، حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ کے اِس پاکیزہ قافلے کوجادہ حق پر استقامت، قبولیت اوراپنی رضا عطاء فرمائیں، اور اِسے ہرقسم کے دینی ودنیوی شرور وفتن خصوصاً ریاء وعجب، کثرت پرستی، خودرائی وغیرہ کے مصائب سے محفوظ فرما کر تواضع، اطاعت، تبتل، یقین، کامل اتباع سنت، ذکر وفکر، تضرع اور خدمت کے اوصاف سے متصف فرما کر امت مسلمہ کی ہدایت ونجات کا وسیلہ بنائیں۔ **آمین بجاہ النبی الکریم وصلی اللہ وسلم علی رسول خیر خلقہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین**

[تقریباً سوا سات سو صفحات کی یہ کتاب اِس نمبر پر رابطہ کر کے منگوائی جاسکتی ہے 0321-2373682]

چھ نمبروں میں ایک نمبر کا اضافہ

''تبلیغی جماعت بلاشبہ دین کی قابل قدر خدمت انجام دے رہی ہے، اگر اِس قابل قدر جماعت کے ذمہ دار حضرات اِن چھ نمبروں میں ایک، ''حقوق العباد'' کا اضافہ بھی کردیں اوراس کی تشریح وتبلیغ بھی اسی اہمیت کے ساتھ فرمائیں تو توقع ہے کہ اِن شاءاللہ اِس سے بہت سے فتنوں کا سد باب ہوسکے گا۔ اور جماعت کا کام بھی زیادہ مفید، مؤثر اور بے ضرر ہوجائے گا۔

[حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب مدظلہ، تبصرے، ص ۱۴۸، بحوالہ ''حیات شیخ زبیر، ص ۲۰۶]